

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَكَلَّمُوا بِأَمْوَالِكُمْ بَيْنَكُمْ  
بِالْبَاطِلِ إِلَّا أَنْ تَكُونَ تِجَارَةً عَن تَرَاضٍ مِّنْكُمْ

# دوری حاضر کے مالی معاملات

کا

## شرعی حکم

حافظ ذوالفقار علی





دور حاضر کے مالی مسائل

کا

شرعی حکم

حافظ ذوالفقار علی حفظہ اللہ

شیخ الحدیث ابو ہریرہ شریعیہ کالج لاہور

ناشر

ابو ہریرہ اکیڈمی

37- کریم بلاک اقبال ٹاؤن لاہور۔ 042-5417233

## جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب: ..... دورِ حاضر کے مالی معاملات کا شرعی حکم

مؤلف: ..... حافظ ذوالفقار علی

اشاعت اول: ..... ستمبر 2008ء

اشاعت دوم: ..... اپریل 2009ء

اشاعت سوم: ..... اگست 2010ء

قیمت: ..... RS 220

ناشر: ..... البوہاریہ اکیڈمی

37- کریم بلاک علامہ اقبال ٹاؤن لاہور فون: 042-35417233

ڈسٹری بیوٹر

دارالکتب السلفیہ اقراء سنٹر غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور

فون: 0423-7361505-03334334804

ملنے کے پتے

دارالکتب السلفیہ اقراء سنٹر غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور

المکتبۃ السلفیہ شیش محل روڈ لاہور، مکتبہ قدوسیہ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور

مکتبہ اسلامیہ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور، اسلامی اکادمی اردو بازار لاہور

## فہرست مضامین

- 14----- پیش لفظ
- 16----- ارشاد باری تعالیٰ
- 17----- فرمودات نبویہ ﷺ
- 18----- باب اولہ:

### اسلام اور جدید مسائل

- 18----- خصوصیات اسلام
- 18----- (۱) عالم گیریت
- 20----- (۲) ابدیت
- 20----- (۳) جامعیت اور ہمہ گیریت
- 22----- اسلام اور معیشت و تجارت
- 23----- بعض شبہات کا ازالہ
- 24----- جواب
- 24----- کاروبار کی جو صورت شریعت کی ہدایات یا مقاصد کے خلاف نہ ہو وہ جائز ہے
- 27----- دوسرا شبہ
- 28----- خلاصہ
- 29----- باب دوم:

### مالی معاملات کے بنیادی اصول

- 30----- ربا (سود)
- 32----- سود کی حرمت پر اجماع ہے

- 33----- ربا کا معنی و مفہوم
- 34----- قرآن کی روشنی میں ربا الفضل کا حکم
- 34----- احادیث میں ربا الفضل کا حکم
- 35----- ربا الفضل کیوں حرام ہے؟
- 36----- دو چیزوں میں تبادلہ کی ممنوعہ صورتیں
- 37----- ربا الفضل کا دائرہ
- 37----- کیا ربا کی حقیقت واضح نہیں؟
- 41----- غَرَرٌ (uncertainty)
- 43----- غرر کا معنی
- 48----- غرر کا دائرہ
- 48----- مشکوک معاملات سے بھی پرہیز ضروری ہے
- 49----- خلاصہ
- 50----- باب سوم :

مروجہ معاملات کی تفصیل

- 50----- کریڈٹ کارڈ
- 50----- کریڈٹ کارڈ کی حقیقت
- 50----- کریڈٹ کارڈ کی تاریخ
- 52----- کارڈز کی مختلف قسمیں
- 52----- (۱) سودی
- 52----- (۲) غیر سودی
- 53----- کارڈز کے فوائد
- 53----- بینک کو حاصل ہونے والے فوائد

- 53----- تاجر کا فائدہ
- 53----- کارڈ ہولڈر کو پہنچنے والے فوائد
- 54----- کارڈز کے نقصانات
- 54----- کریڈٹ اور چارج کارڈز کا شرعی حکم
- 55----- ڈیبٹ کارڈ (Debit Card) کا استعمال جائز ہے
- 56----- انشورنس (التامین)
- 57----- انشورنس کی ابتدا
- 58----- انشورنس کا مفہوم
- 59----- انشورنس کی قسمیں
- 59----- (۱) گروپ انشورنس
- 60----- (۲) میوچل انشورنس
- 60----- (۳) کمرشل انشورنس
- 60----- لائف انشورنس
- 61----- گڈز انشورنس
- 61----- تھرڈ پارٹی انشورنس
- 61----- کمرشل انشورنس کا شرعی حکم
- 62----- لیزنگ
- 63----- لیزنگ کا جدید مفہوم
- 65----- ایک شبہ کا ازالہ
- 65----- لیزنگ کا متبادل
- 66----- مروجہ لیزنگ کا دوسرا متبادل
- 66----- شیئرز (حصص) کی خرید و فروخت
- 66----- شیئرز کی تاریخ

- 67----- شیرز کی حقیقت
- 68----- شرعی حکم
- 69----- شیرز کی خرید و فروخت کی بعض ناجائز صورتیں
- 70----- فیوچر سیل
- 70----- شارٹ سیل
- 71----- بدلہ (Carey Over)
- 72----- کاروباری دستاویزات
- 72----- کاروباری دستاویزات سے مراد
- 73----- اوراق تجاریہ کی تاریخ ابتداء
- 74----- کاروباری دستاویزات اور کاغذی کرنسی میں فرق
- 74----- کمرشل اور فنانشل پیپرز کا باہمی فرق
- 76----- کمرشل پیپرز کی مختلف قسمیں اور ان میں باہمی فرق
- 76----- ہنڈی
- 77----- پرامیسری نوٹ
- 77----- چیک
- 78----- شرعی حکم
- 80----- بینک کی وساطت سے وصولی کا حکم
- 81----- ایک شبہ کا ازالہ
- 81----- ہنڈی بھنانے کا حکم
- 83----- بعض شبہات کا ازالہ
- 83----- جواب
- 84----- دوسرا شبہ
- 84----- جواب
- 84----- تیسرا شبہ

85	جواب
88	حقوق کی بیع
88	حق التالیف
89	حق التالیف کی تاریخ
90	حق ایجاد
91	تجارتی نام اور علامات
91	معنوی حقوق کی بیع کا شرعی حکم
92	قائلین کے دلائل
93	مانعین کے دلائل
93	راجح رائے
96	گپڑی
96	ارضی وقف میں گپڑی کی صورتیں
96	ارضی بیت المال میں گپڑی کی صورت
97	ذاتی پراپرٹی میں گپڑی کا مفہوم
97	گپڑی کا فائدہ
97	گپڑی کے مختلف نام
98	گپڑی کی تاریخ و ارتقاء
100	گپڑی کا حکم
103	ملاحظہ
104	قسطوں پر خرید و فروخت
104	پہلا واقعہ
105	دوسرا واقعہ
106	قسطوں پر خریداری کی مختلف صورتیں



107	قائلین جواز کے دلائل
108	مانعین کے دلائل
109	راجح نقطہ نظر
113	بیع عینہ کا مطلب
113	ملاحظہ
114	خلاصہ
115	باب چہارم:

### اسلامی بینکاری کی حقیقت!

115	اسلامی بینکاری کا مطلب
117	اسلامی بینکاری کی تاریخ ابتدا
118	اسلامی بینکاری کی ترقی و فروغ
118	اسلامی بینکوں کے معاملات کا اجمالی تذکرہ
118	سرمایہ حاصل کرنے کے ذرائع
119	سرمایہ فراہم کرنے کے طریقے
120	براہ راست سرمایہ کاری کی شکلیں
120	بینکاری خدمات
120	اسلامی بینکوں کا پیش کردہ متبادل مثالی نہیں
122	اسلامی بینکوں کا عذر
123	مروجہ اسلامی بینکاری علماء کی نظر میں
124	موجودہ اسلامی بینکوں پر تنقید کی وجوہ
124	اسلامی بینکوں میں راجح اجارہ کا مقصد فائنانسنگ ہے نہ کہ حقیقی اجارہ

- 126 ----- شرح سود کو معیار بنانا
- 127 ----- اسلامی بینکوں کا طریقہ بھی سودی بینکوں جیسا ہے
- 129 ----- تاخیر پر جرمانہ
- 129 ----- شریعت میں تاخیر پر جرمانہ کا تصور نہیں ہے
- 130 ----- ماہرین اسلامی بینکاری کی نظر میں بھی جرمانہ جائز نہیں
- 131 ----- امام خطاب رضی اللہ عنہ کے قول سے غلط استدلال
- 132 ----- اسلامی بینکوں کا نقطہ نظر
- 133 ----- اسلامی بینک نان رسک ہیں
- 134 ----- اسلامی بینکوں میں رائج طریقہ ہائے تمویل کی حقیقت
- 134 ----- مضاربہ
- 135 ----- مضارب کی حیثیت
- 136 ----- مضاربہ کی شرطیں
- 137 ----- مضاربہ کا میدان
- 141 ----- اسلامی بینکوں میں رائج مضاربہ کی حقیقت
- 144 ----- مرابحہ
- 145 ----- مرابحہ کی ضرورت اور اس کے بنیادی اصول
- 146 ----- مرابحہ کی مختلف قسمیں اور ان کا شرعی حکم
- 148 ----- رائج رائے
- 149 ----- مرابحہ میں ضمنی اخراجات کا حکم
- 149 ----- بیع مرابحہ اور بینکاری
- 150 ----- اسلامی بینکوں میں رائج مرابحہ
- 152 ----- مروجہ مرابحہ کا شرعی حکم
- 152 ----- کلائنٹ کے ذریعے خریداری کی شرعی حیثیت

- 153 ----- پہلی صورت
- 158 ----- دوسری صورت
- 159 ----- تیسری صورت
- 160 ----- اسلامی بینکوں کا نقطہ نظر
- 162 ----- اجارہ مُنتَهِيَةٌ بِالتَّمْلِيكِ
- 163 ----- اسلامی بینکوں میں رائج اجارہ اور سودی بینکوں میں رائج ہائر پر چیز میں فرق
- 164 ----- ملکیت منتقل ہونے کے طریقے
- 165 ----- ضَمَانِ جِدَّةِ يَه كِي شَرَعِي حَيْثِيَّت
- 165 ----- اگر چیز تباہ ہو جائے یا قابل استعمال نہ رہے؟
- 166 ----- اجارہ منتهية بالتتمليك کا شرعی حکم
- 168 ----- مشارکہ متناقصہ (Diminishing Musharakah)
- 171 ----- مشارکہ متناقصہ شرکت کی کس قسم میں داخل ہے
- 171 ----- شركة العنان کیا ہے؟
- 172 ----- مشارکہ متناقصہ میں بینک اپنے حصے کے یونٹ کس قیمت پر بیچے گا
- 174 ----- بینک اپنا حصہ کس قیمت پر فروخت کرتا ہے
- 175 ----- تَوْرُق
- 176 ----- تورق اور بیع عینہ میں فرق
- 177 ----- تورق کا شرعی حکم
- 179 ----- رائج رائے
- 179 ----- بینکوں میں تورق کا استعمال
- 180 ----- شرعی حیثیت
- 181 ----- بَيْعِ سَلَم



- 183 ..... سلم کی اجازت کا فلسفہ
- 183 ..... کیا سلم خلاف قیاس ہے؟
- 184 ..... سلم کی شرطیں
- 188 ..... ملاحظہ
- 188 ..... سلم میں رہن اور ضمانت طلب کرنا
- 189 ..... سلم میں قبضہ کی مدت
- 189 ..... حوالگی میں تاخیر پر جرمانہ
- 191 ..... قبضہ سے پہلے بیچنا
- 191 ..... تجارت میں سلم کا استعمال
- 195 ..... اسلامی بینکوں میں سلم کا استعمال
- 197 ..... سلم متوازی
- 197 ..... اِستِضَاع
- 198 ..... استصناع اور سلم میں فرق
- 198 ..... استصناع کی بنیاد پر بینکاری
- 199 ..... مروجہ اسلامی بینکوں کا طریقہ
- 200 ..... گارنٹی پر کمیشن کا حکم
- 201 ..... ایک توجیہ کا جواب
- 202 ..... اسلامی بینکوں کا پیش کردہ حل
- 203 ..... ایل سی کھولنے کا طریقہ
- 204 ..... ایل سی کا صحیح حل اور اسلامی بینک
- 206 ..... پراپیگنڈہ کا جواب
- 206 ..... خلاصہ

208 ----- باب پنجم:

### تکافل: مروجہ اسلامی انشورنس

- 208 ----- تکافل کا معنی و مفہوم
- 210 ----- اسلام میں تکافل کی اہمیت
- 212 ----- اسلامی تکافل کی ہمہ گیریت
- 214 ----- تکافل کی مختلف صورتیں
- 215 ----- اسلامی تکافل کی خصوصیت
- 216 ----- مروجہ تکافل اور اس کا طریقہ کار
- 218 ----- مروجہ تکافل کی قسمیں
- 219 ----- فیملی تکافل
- 220 ----- جنرل تکافل
- 220 ----- کیا مروجہ تکافل سود اور غرر سے پاک ہے؟
- 220 ----- کیا یہ عقد معاوضہ نہیں؟
- 221 ----- ایک تاویل کا جواب
- 222 ----- کیا نقدی کو وقف کیا جاسکتا ہے؟
- 225 ----- صحیح موقف
- 227 ----- ایک شبہ کا ازالہ
- 230 ----- بعض تحقیق طلب مسائل
- 231 ----- ایک غیر معقول استدلال
- 231 ----- خلاصہ

باب ششم ----- 232

## قرض کے مسائل

- 232 ----- قرض لینا پسندیدہ نہیں
- 233 ----- معقول عذر کی بنا پر قرض لینے کی اجازت ہے
- 233 ----- قرض معاف نہیں ہوگا
- 234 ----- قرض کے بدلے فائدہ اٹھانا
- 235 ----- قرض میں گروی کا مطالبہ جائز مگر اس سے فائدہ اٹھانا جائز ہے
- 236 ----- مکان گروی لین دین کی شرعی حیثیت
- 236 ----- قرض اور دین (Debt) میں فرق
- 237 ----- قرض اور دین کی ادائیگی کا معیار
- 239 ----- ایک اعتراض کا جواب
- 240 ----- خلاصہ





بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

## پیش لفظ

مسلمان ہونے کے ناطے ہمارا یہ پختہ اعتقاد ہے کہ انسانی زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں خواہ وہ انفرادی ہو یا اجتماعی، سیاسی ہو یا اخلاقی، معاشرتی ہو یا معاشی جس کے متعلق دین میں اصولی رہنمائی موجود نہ ہو۔ مثلاً معیشت و تجارت کو لے لیجئے قرآن و حدیث میں اس حوالے سے واضح، غیر مبہم اور قطعی اصول بیان ہوئے ہیں جن کی روشنی میں ہم ہر دور میں پیش آنے والے مسائل کا حل تلاش کر سکتے ہیں۔ ہمارے محدثین کا یہ عظیم کارنامہ ہے کہ انہوں نے عبادات ہی کی طرح معاملات سے متعلق احادیث نبویہ ﷺ بھی ہم تک پہنچائی ہیں۔

کتب حدیث میں معاملات کے ابواب کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ کیونکہ جب تک معاملات درست نہ ہوں انسان کا ایمان مکمل نہیں ہو سکتا ہے اور نہ ہی اس کی زندگی اسلامی زندگی بن سکتی ہے۔ اسی لیے ہمارے پیارے نبی ﷺ نے حرام کے علاوہ مشتبہ امور کے ارتکاب کو بھی انسان کے دین اور آبرو کے لیے خطرے کی علامت قرار دیا ہے۔ چنانچہ آپ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے۔

((فَمَنْ اتَّقَى الْمُسْتَبْهَاتِ اسْتَبْرَأَ لِدِينِهِ وَعِرْضِهِ ، وَمَنْ وَقَعَ فِي الشُّبُهَاتِ كَرَّاعٍ يَرْعَى حَوْلَ الْحِمَى ، يُوشِكُ أَنْ يُوَاقِعَهُ))

[صحیح البخاری: کتاب الایمان، باب فضل من استبرأ لدینہ]

”جو شخص شہات سے بچا اس نے اپنا دین اور عزت بچالی۔ اور جو شہات میں پڑ گیا اس کی مثال اس چرواہے کی ہے جو (شاہی) چراگاہ کے قریب جانور چراتا ہے قریب ہے کہ وہ جانور اس میں داخل ہو جائیں۔“

مگر بد قسمتی کی بات ہے کہ آج مسلمانوں کی اکثریت دین سے بیگانگی کے باعث

اسلام کے ان سنہری اصولوں سے نابلد ہے۔ جو لوگ نماز، روزہ کے پابند ہیں ان میں بھی ایک طبقہ ایسا ہے جس نے دین صرف عبادات، نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کا نام سمجھ لیا ہے۔ مالی معاملات کے بارہ میں احکام شرعیہ کو اس طرح نظر انداز کیے ہوئے ہیں کہ گویا ان کا دین کے ساتھ کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔ بالخصوص جدید معاملات کے متعلق ان کا اندازِ فکر یہ ہے کہ یہ معاملات چونکہ دورِ حاضر کی پیداوار ہیں عہد رسالت میں ان کا وجود ہی نہیں تھا اس لیے یہ جائز ہیں۔ ان حالات میں اہل علم پر بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ معاملاتِ جدیدہ کو سمجھیں اور لوگوں کی صحیح اور کما حقہ رہنمائی کریں۔

علمائے کرام تبریک و تحسین اور قدر افزائی کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اس حوالے سے قابل قدر کام کیا ہے۔ خصوصاً علمائے عرب نے اس سلسلے میں بہت عمدہ کوششیں کی ہیں۔ جدید مالی معاملات میں سے شاذ و نادر ہی کوئی ایسا مسئلہ ہوگا جس پر عربی زبان میں مستقل کتاب نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ سب کی مساعی حسنہ کو قبول فرمائے اور اس خدمت کو ذریعہ نجات بنائے۔

احقر نے بھی اس ضمن میں ادنیٰ سی کاوش کی ہے جو

دورِ حاضر کے مالی معاملات کا شرعی حکم

کے عنوان سے نذر قارئین ہے

یاد رہے! یہ کتاب اصل میں راقم کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو وقتاً فوقتاً ہفت روزہ ”الاعتصام“ اور بعض دیگر جرائد میں شائع ہوتے رہے ہیں اب حک و اضافہ کے بعد ان کو کتابی شکل میں شائع کیا جا رہا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو حرام اور مشتبہ امور سے بچنے کی توفیق عطا فرمائے۔

حافظ ذوالفقار علی

ابو ہریرہ شریعہ کالج

37- کریم بلاک علامہ اقبال ٹاؤن لاہور

## ارشاد باری تعالیٰ

﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا إِن كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ۝ فَإِن لَّمْ تَفْعَلُوا فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَإِن تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ ۝ ﴾ [البقرة: ۲۷۹-۲۷۸]

”اے ایمان والو! اللہ سے ڈر جاؤ اور چھوڑ دو باقی سود، اگر تم مومن ہو۔ پھر اگر تم نے یہ نہ کیا تو اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ اور اگر تم نے توبہ کر لی تو تمہارے لیے تمہارے اصل مال ہیں نہ تم ظلم کرو اور نہ تم ظلم کیے جاؤ۔“

\*.....\*

﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالِكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ إِلَّا أَنْ تَكُونَ تِجَارَةً عَن تَرَاضٍ مِّنْكُمْ وَلَا تَقْتُلُوا أَنْفُسَكُمْ إِنَّ اللَّهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيمًا ۝ ﴾ [النساء: ۲۹]

”اے ایمان والو! تم اپنے مال آپس میں باطل طریقے سے نہ کھاؤ مگر یہ کہ تجارت ہو تمہاری باہمی رضامندی سے اور نہ تم قتل کرو اپنے نفسوں کو بلاشبہ اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ نہایت رحم کرنے والا ہے۔“





### فرموداتِ نبویہ علیٰ جناب رسول اللہ ﷺ

((يَأْتِي عَلَى النَّاسِ زَمَانٌ لَا يُبَالِي الْمَرْءُ مَا أَخَذَ مِنْهُ أَمِنَ الْحَلَالِ  
أَمْ مِنْ الْحَرَامِ)) [صحيح بخارى: كتاب البيوع، باب من لم يبال  
من حيث كسب المال]

”لوگوں پر ایک زمانہ آئے گا جب انسان کو اس کی پروا نہیں رہے گی کہ اس نے جو  
حاصل کیا ہے وہ حلال ہے یا حرام۔“

\*.....\*

((دَعُ مَا يَرِيئُكَ إِلَى مَا لَا يَرِيئُكَ)) [سنن الترمذی: ابواب  
الزهد عن رسول الله صلى الله عليه وسلم، رقم الحديث ۲۷۰۸]  
”جو چیز تجھے شک میں ڈالے اس کو چھوڑ دے جو شک میں نہ ڈالے اس کو  
قبول کر لے۔“

\*.....\*

(( لَا يَحِلُّ سَلْفٌ وَيَيْعٌ وَلَا شَرْطَانِ فِي بَيْعٍ وَلَا رِبْحٌ مَا لَمْ يُضْمَنْ وَلَا  
بَيْعٌ مَا لَيْسَ عِنْدَكَ )) [سنن الترمذی، باب ما جاء في كراهية بيع  
ماليس عنده]

”قرض اور بیع، ایک بیع میں دو شرطیں اور اس چیز کا نفع جس کا رسک برداشت نہ کیا گیا  
ہو جائز نہیں اور اس چیز کی بیع بھی درست نہیں جو دینے والے کے پاس موجود نہیں۔“



## اسلام اور جدید مسائل

خصوصیاتِ اسلام:

اللہ تعالیٰ نے دین اسلام کو جن امتیازی خوبیوں سے نوازا ہے ان میں تین خوبیاں بڑی نمایاں ہیں:

۱۔ عالم گیریت۔

۲۔ ابدیت (قیامت تک کے لیے)۔

۳۔ جامعیت اور ہمہ گیریت۔

(۱) عالم گیریت:

یعنی اسلام کے مخاطب کسی ایک نسل یا خطے کے لوگ نہیں بلکہ یہ ہر دور اور ہر علاقے کے لیے ہے۔

﴿قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ يُحْيِي وَيُمِيتُ فَأَمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ النَّبِيِّ الْأُمِّيِّ الَّذِي يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَكَلِمَتِهِ وَاتَّبِعُوهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ﴾ [الاعراف: ۱۵۸]

”آپ فرمادیں: لوگو! میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں جو آسمانوں اور زمین کی سلطنت کا مالک ہے اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں، وہی زندہ کرتا اور مارتا ہے، لہذا اللہ اور اس کے رسول نبی امی (ﷺ) پر ایمان لاؤ جو اللہ اور اس کے ارشادات پر ایمان لاتا ہے اور اسی کی پیروی کرو امید ہے تم راہِ راست پا لو گے۔“

﴿وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ﴾ [الانبیاء: ۱۰۷]

”اور ہم نے آپ ﷺ کو تمام دنیا والوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔“

﴿تَبَارَكَ الَّذِي نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلَى عَبْدِهِ لِيَكُونَ لِلْعَالَمِينَ نَذِيرًا ۝﴾

[الفرقان: ۱]

”بہت بابرکت ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے پر فرقان (قرآن) نازل کیا

تا کہ وہ تمام جہانوں کے لیے (برے انجام سے) ڈرانے والا بن جائے۔“

﴿وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِلنَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا وَلَكِنَّ أَكْثَرَ

النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ۝﴾ [السبأ: ۲۸]

”اور ہم نے آپ کو تمام لوگوں کے لیے بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا

مگر اکثر لوگ نہیں جانتے۔“

﴿إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِلْعَالَمِينَ ۝﴾ [التکویر: ۲۷]

”یہ تو سارے جہاں والوں کے لیے نصیحت ہے۔“

نبی ﷺ کی حدیث ہے:

((أُعْطِيتُ خَمْسًا لَمْ يُعْطَهُنَّ أَحَدٌ قَبْلِي نُصِرْتُ بِالرُّعْبِ مَسِيرَةَ شَهْرٍ

وَجُعِلَتْ لِي الْأَرْضُ مَسْجِدًا وَطَهُورًا فَأَيُّمَا رَجُلٍ مِنْ أُمَّتِي أَدْرَكَتْهُ

الصَّلَاةُ فَلْيُصَلِّ وَأُحِلَّتْ لِي الْمَغَانِمُ وَلَمْ تَحِلَّ لِأَحَدٍ قَبْلِي وَأُعْطِيتُ

الشَّفَاعَةَ وَكَانَ النَّبِيُّ يُعْتَرُ إِلَى قَوْمِهِ خَاصَّةً وَبُعِثْتُ إِلَى النَّاسِ عَامَّةً))

[صحیح بخاری: کتاب التیمم، باب قول اللہ تعالیٰ فلم تجدوا ماء

فتيمموا صعيدا طيبا]

”مجھے پانچ چیزیں دی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی کو نہیں دی گئیں۔

۱۔ ایک مہینے کی مسافت پر رعب کے ساتھ میری مدد کی گئی ہے۔

۲۔ میرے لیے زمین مسجد اور پاک کرنے والی بنا دی گئی ہے، میری امت میں

سے جس آدمی کو جہاں نماز کا وقت پالے وہ نماز پڑھ لے۔

۳۔ میرے لیے غنیمتیں حلال کی گئیں ہیں جو مجھ سے پہلے کسی کے لیے حلال

نہیں تھیں۔

۴۔ مجھے شفاعت عطا کی گئی ہے۔

۵۔ پہلے انبیاء علیہم السلام خاص قوم کی طرف آتے تھے اور مجھے تمام لوگوں کی طرف نبی بنا کر بھیجا گیا ہے۔“

(۲) ابدیت:

یعنی اسلامی تعلیمات ایک خاص دور یا مخصوص مدت کے لیے نہیں بلکہ قیامت تک کے لیے ہیں کیونکہ یہ آخری دین اور نبی ﷺ آخری نبی ہیں۔

﴿مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِّن رِّجَالِكُمْ وَلَكِن رَّسُولَ اللَّهِ

وَخَاتَمَ النَّبِيِّينَ وَكَانَ اللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا ۝﴾ [الاحزاب: ۴۰]

”محمد (ﷺ) تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں بلکہ وہ اللہ کے

رسول اور خاتم النبیین ہیں اور اللہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہیں۔“

ختم نبوت کا تقاضا یہی ہے کہ اس دین کی تعلیمات ایک مخصوص مدت کے لیے نہ ہوں بلکہ قیامت تک کے لیے ہوں۔

نبی ﷺ کا فرمان ہے:

((نَحْنُ الْآخِرُونَ السَّابِقُونَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ)) [صحیح بخاری:

کتاب الجمعة، باب فرض الجمعة]

”ہم آخری ہیں لیکن قیامت کے دن سب سے آگے ہوں گے۔“

(۳) جامعیت اور ہمہ گیریت:

اس کا مطلب ہے کہ زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس کے متعلق اسلام نے ہماری رہنمائی نہ کی ہو، اس میں ضروریات زندگی کے تمام مسائل کا حل موجود ہے۔

﴿وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تَبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَهُدًى وَرَحْمَةً

وَبُشْرَىٰ لِلْمُسْلِمِينَ ۝﴾ [النحل: ۸۹]

”اور ہم نے آپ ﷺ پر ایسی کتاب نازل کی ہے جس میں ہر چیز کی وضاحت

موجود ہے اور اس میں مسلمانوں کے لیے ہدایت، رحمت اور خوشخبری ہے۔“

﴿وَلَقَدْ جِئْنَاهُمْ بِكِتَابٍ فَصَّلْنَاهُ عَلَىٰ عِلْمٍ هُدًى وَرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ۝﴾ [الاعراف: ۵۲]

”ہم ان کے پاس ایسی کتاب لائے ہیں جسے ہم نے علم کی بنا پر مفصل بنا دیا ہے، یہ کتاب ان لوگوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے جو ایمان لاتے ہیں۔“

﴿وَ كُلِّ شَيْءٍ فَصَّلْنَاهُ تَفْصِيلًا ۝﴾ [بنی اسرائیل: ۱۲]

”اور ہم نے ہر چیز کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔“

﴿لَقَدْ كَانَ فِي قَصصِهِمْ عِبْرَةٌ لِأُولَى الْأَلْبَابِ مَا كَانَ حَدِيثًا يُفْتَرَىٰ وَلَكِن تَصْدِيقَ الَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيلَ كُلِّ شَيْءٍ وَهُدًى وَرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ۝﴾ [یوسف: ۱۱۱]

”ان قصوں میں اہل عقل و خرد کے لیے (کافی سامان) عبرت ہے، یہ قرآن کوئی ایسی بات نہیں جو گھڑی گئی بلکہ یہ تو اپنے سے پہلی کتابوں کی تصدیق کرتا ہے، اس میں ہر بات کی تفصیل موجود ہے اور ایمان لانے والوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے۔“

﴿الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ﴾ میں جس اکمال کا اعلان فرمایا گیا ہے اس کا معنی بھی یہی ہے کہ اس میں انسانی ضرورت اور حلت و حرمت کی تمام باتیں بیان کر دی گئی ہیں۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

((فليست تنزل في أحد من أهل دين الله نازلة إلا وفي كتاب

الله الدليل)) [الرسالة: ج ۱، ص ۲۰]

”کتاب اللہ میں مسلمانوں کو ہر پیش آمدہ مسئلے کے متعلق راہ نمائی موجود ہے۔“

شیخ الحدیث امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

((لا اعلم شيئاً يحتاج إليه الا وهو في الكتاب والسنة))

”کتاب و سنت میں تمام ضروری مسائل کا حل موجود ہے۔“



پوچھا گیا:

(( هل يمكن معرفة ذلك؟ قال نعم )) [مقدمة فتح الباری: ص ۴۸۹]

”کیا اس کی معرفت ممکن ہے؟ کہا ہاں۔“

ثابت ہوا کہ اسلام میں بدلتے ہوئے معروضی حالات اور عصری تقاضے پورے کرنے کی مکمل صلاحیت موجود ہے۔

اسلام اور معیشت و تجارت:

صنعت و تجارت انسانی زندگی کے لازمی اجزاء ہیں، ان کے متعلق اسلام کیوں کر خاموش رہ سکتا تھا۔ قرآن و حدیث میں معاملات کے بارے میں بالکل واضح اور غیر مبہم ہدایات دی گئی ہیں، جو صورتیں معاشرے کے لیے مفید تھیں انہیں باقی رکھا گیا ہے اور جو مضر تھیں وہ سب حرام قرار دی گئیں ہیں:

﴿وَأَحَلَّ اللَّهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا ۚ﴾ [البقرة: ۲۷۵]

”اور اللہ نے بیع کو حلال کیا اور سود کو حرام قرار دیا ہے۔“

﴿وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوا بِهَا إِلَى الْحُكَّامِ لِتَأْكُلُوا

فَرِيقًا مِنْ أَمْوَالِ النَّاسِ بِالْإِثْمِ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ ۚ﴾ [البقرة: ۱۸۸]

”اور آپس میں ایک دوسرے کا مال باطل طریقے سے نہ کھاؤ نہ مقدمات اس غرض سے حکام تک لے جاؤ کہ دوسرے کے مال کا کچھ حصہ ناحق طور پر ہضم کر جاؤ، حالانکہ حقیقت حال تمہیں معلوم ہوتی ہے۔“

مشہور محدث و مفسر ابن العربی رحمہ اللہ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

”یہ آیت معاملات کے قواعد میں سے اور معاوضات کی اساس ہے۔“ [احکام القرآن:

جلد ۱، ص ۱۸۵]

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ إِلَّا أَنْ

تَكُونُ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِنْكُمْ وَلَا تَقْتُلُوا أَنْفُسَكُمْ إِنَّ اللَّهَ

كَانَ بِكُمْ رَحِيمًا ۝﴾ [النساء: ۲۹]

”اے ایمان والو! تم اپنے مال آپس میں باطل طریقے سے نہ کھاؤ مگر یہ کہ تجارت ہو تمہاری باہمی رضامندی سے اور نہ تم قتل کرو اپنے نفسوں کو بلاشبہ اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ نہایت رحم کرنے والا ہے۔“

اس ممانعت میں ناجائز طریقے سے مال حاصل کرنے کے تمام ذرائع شامل ہیں چونکہ اسلامی ہدایات سراسر معاشرے کے مفاد میں ہیں۔ جن کو نظر انداز کرنے سے معاشی بگاڑ پیدا ہونا یقینی امر ہے، اس لیے مسلم معاشرے میں ان لوگوں کو کاروبار کی قطعی اجازت نہیں جو تجارت کے متعلق اسلامی احکام سے ناواقف ہوں، چنانچہ خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے۔

(( لَا يَبِيعُ فِي سُوقِنَا إِلَّا مَنْ تَفَقَّهَ فِي الدِّينِ )) [جامع ترمذی :

ابواب الوتر، باب ماجاء فی فضل الصلاة علی النبی]

”ہمارے بازاروں میں وہی خرید و فروخت کرے جسے دین کی سمجھ ہو۔“

یعنی خرید و فروخت کے متعلق دینی احکام سے آگاہ ہو۔ امام ترمذی نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس ارشاد کو حسن قرار دیا ہے۔

بعض شبہات کا ازالہ:

پہلا شبہ: بعض جدت پسندوں کے خیال میں اسلامی ہدایات تمام نسلوں اور زمانوں کے لیے ہیں مگر ان کا دائرہ عمل صرف عقائد و عبادات تک محدود ہے۔ سیاسی، معاشی اور معاشرتی معاملات میں ہم آزاد ہیں کہ اپنے حالات کے مطابق جس طرح چاہیں فیصلہ کریں، اس نقطہ نظر کی تائید میں ایک روایت بھی توڑ مروڑ کر پیش کی جاتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

(( أَنْتُمْ أَعْلَمُ بِأَمْرِ دُنْيَاكُمْ )) [صحیح مسلم: کتاب الفضائل، باب

وجوب امثال ما قاله شرعا.....]

”تم اپنے دنیوی معاملات کو بہتر جانتے ہو۔“

جواب:

ہمارے نزدیک اس غلط فہمی کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے ان مہربانوں نے دیگر مذاہب کی طرح دین اسلام کو بھی محض چند مخصوص عقائد اور خود ساختہ رسومات کا مجموعہ سمجھ لیا ہے حالانکہ اسلام تو ایک مکمل ضابطہ حیات ہے جو دینی معاملات کے ساتھ ساتھ سیاسی، معاشرتی اور معاشی مسائل جیسے تمام معاملات کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ دین و دنیا کی جو تفریق عیسائیت میں ہے کہ شخصی زندگی کے ایک محدود گوشے کے سوا باقی اجتماعی اور سیاسی زندگی مذہب کے دائرہ بحث سے خارج ہے اسلام میں اس کی گنجائش نہیں ہے۔ دین کا ہر طالب علم اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہے کہ قرآن مجید میں سیاسی، معاشی اور معاشرتی مسائل کے بارہ میں بھرپور راہنمائی موجود ہے۔

جن حضرات کو صحیح بخاری کے مطالعہ کا موقع ملا ہے وہ ہمارے موقف کی تائید فرمائیں گے کہ کس طرح امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے صحیح بخاری میں عقائد و عبادات، معاشی و معاشرتی مسائل، سیاسی امور، بین الاقوامی تعلقات، حدود و تعزیرات اور دیگر گوشے ہائے زندگی کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث جمع فرمادی ہیں، باقی رہ گئے آپ کے زیر بحث الفاظ تو ان کا ایک خاص محل ہے وہ یہ کہ ہماری زندگی کا وہ دائرہ جسے ہم دنیا سے تعبیر کرتے ہیں اس کے متعلق اسلام نے صرف بنیادی باتیں ذکر کی ہیں اس کے بعد ہمیں آزاد چھوڑ دیا ہے تفصیلات و جزئیات بیان نہیں کیں، البتہ وہ امور جن کو دین کہا جاتا ہے ان میں ہمیں اس بات کا پابند کیا گیا ہے کہ ہم اپنی مرضی سے ایک قدم ادھر ادھر نہیں اٹھا سکتے۔

کاروبار کی جو صورت شریعت کی ہدایات یا مقاصد کے خلاف نہ ہو وہ جائز ہے:

اس بات کو علماء رضی اللہ عنہم یوں بیان کرتے ہیں:

”عبادات میں اصل حرمت ہے جب تک شارع کی طرف سے نص نہ ہو کوئی کام

کرنا جائز نہیں ہوتا اور معاملات میں اصل اباحت ہے یعنی لین دین کی ہر وہ

صورت جائز ہے جس سے شریعت نے منع نہ کیا ہو۔“

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

((وَالأصل في هذا انه لا يحرم على الناس من المعاملات التي يحتاجون اليها إلا ما دل الكتاب والسنة على تحريمه كما لا يشرع لهم من العبادات التي يتقربون بها إلى الله إلا ما دل الكتاب والسنة

على شرعه)) [مجموع الفتاوى لابن تيمية: ج 28، ص 386]

”اس بارہ میں اصل یہ ہے کہ وہ معاملات جن کی لوگوں کو ضرورت ہوتی ہے ان میں سے صرف وہی حرام ہیں جن کی حرمت پر کتاب و سنت دلالت کر رہی ہوں جیسا کہ عبادات میں سے وہی جائز ہیں جن کی مشروعیت پر قرآن و حدیث میں رہنمائی موجود ہو۔“

زیر بحث حدیث کے علاوہ ذیل کی احادیث سے بھی اس اصول کی تائید ہوتی ہے:

((المُسْلِمُونَ عِنْدَ شُرُوطِهِمْ)) [صحيح البخارى: كتاب الاجاره، باب اجر السمسرة]

”مسلمان اپنی شرطوں کے پابند ہیں۔“

دوسرے مقام پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

((المُسْلِمُونَ عَلَى شُرُوطِهِمْ إِلَّا شَرْطًا حَرَّمَ حَالًا أَوْ أَحَلَّ حَرَامًا)) [سنن ترمذی: كتاب الاحكام، باب ما ذكر عن رسول الله في الصلح بين الناس]

”مسلمان اپنی شرطوں کے پابند ہیں مگر وہ شرط جو حرام کو حلال یا حلال کو حرام قرار دے“

عبادات کے متعلق آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

((صَلُّوا كَمَا رَأَيْتُمُونِي أُصَلِّي)) [صحيح بخارى: كتاب الاذان، باب الاذان للمسافر اذا كانو جماعة.....]

”نماز پڑھو! جس طرح مجھے نماز پڑھتے دیکھتے ہو۔“

متذکرہ بالا احادیث کے علاوہ یہ آیات بھی اس کی تائید کرتی ہیں:

﴿قُلْ أَرَأَيْتُمْ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ لَكُمْ مِنْ رِزْقٍ فَجَعَلْتُمْ مِنْهُ حَرَامًا  
وَحَلَالًا قُلْ اللَّهُ أَدْنَىٰ لَكُمْ أُمَّ عَلَى اللَّهِ تَفْتَرُونَ ۝﴾ [یونس: ۵۹]

”آپ ﷺ ان سے کہیں کیا تم نے سوچا کہ اللہ نے تمہارے لیے جو رزق اتارا تھا  
اس میں سے تم نے خود ہی کسی کو حرام قرار دے لیا اور کسی کو حلال، تو کیا اللہ نے تم کو  
اس کی اجازت دی ہے یا تم اللہ پر جھوٹ باندھتے ہو؟“

﴿اللَّهُ الَّذِي سَخَّرَ لَكُمْ الْبَحْرَ لِتَجْرِيَ الْفُلُكُ فِيهِ بِأَمْرِهِ  
وَلِتَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِهِ وَلِعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ۝ وَسَخَّرَ لَكُمْ مِمَّا فِي  
السَّمَوَاتِ وَمِمَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مِنْهُ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ  
لِقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ ۝﴾ [الحاثیة: ۱۲، ۱۳]

”اللہ ہی ہے جس نے سمندر کو تمہارے تابع کر دیا تاکہ اس کے حکم سے اس میں  
کشتیاں چلیں اور تم اس کا فضل تلاش کرو اور اس کے شکر گزار بنو اور جو کچھ آسمانوں  
میں یا زمین میں ہے سب کچھ تمہارے لیے کام پر لگا رکھا ہے غور و فکر کرنے والوں  
کے لیے اس میں بہت سی نشانیاں ہیں۔“

سورۃ یونس کی متذکرہ بالا آیت ان لوگوں کے متعلق نازل ہوئی ہے جنہوں نے  
اپنے آباؤ اجداد کی عادات اور عرف کی بنیاد پر بعض چیزوں کو حرام قرار دے رکھا تھا۔

﴿وَلَا تَقُولُوا لِمَا تَصِفُ أَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هَذَا حَلَالٌ وَهَذَا  
حَرَامٌ لَتَفْتَرُوا عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ إِنَّ الَّذِينَ يَفْتَرُونَ عَلَى اللَّهِ  
الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُونَ ۝﴾ [النحل: ۱۱۶]

”جو جھوٹ تمہاری زبانوں پر آجائے اس کی بنا پر یوں نہ کہا کرو کہ یہ چیزیں حلال  
ہیں اور یہ حرام ہیں تاکہ تم اللہ پر جھوٹ باندھنے لگو اور جو اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں  
وہ کبھی فلاح نہیں پاتے۔“

اس آیت میں خواہشات نفس سے مباح اشیاء کو حرام قرار دینے کی ممانعت ہے:



﴿وَقَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ إِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ إِلَيْهِ ۝﴾

[الانعام: ۱۱۹]

”جو کچھ اس نے تم پر حرام کیا ہے اسے تمہارے لیے تفصیلاً بیان کر دیا گیا ہے الا یہ کہ تم (کوئی حرام چیز کھانے پر) مجبور ہو جاؤ۔“

امام ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

((فَكُلُّ مَا لَمْ يُفَصَّلْ لَنَا تَحْرِيمُهُ فَهُوَ حَالِلٌ بِنَصِّ الْقُرْآنِ، إِذْ لَيْسَ فِي الدِّينِ إِلَّا فَرَضٌ أَوْ حَرَامٌ أَوْ حَالِلٌ، فَالْفَرَضُ مَأْمُورٌ بِهِ فِي الْقُرْآنِ وَالسُّنَّةِ، وَالْحَرَامُ مُفَصَّلٌ بِاسْمِهِ فِي الْقُرْآنِ وَالسُّنَّةِ، وَمَا عَدَا هَذَيْنِ فَلَيْسَ فَرَضًا وَلَا حَرَامًا فَهُوَ بِالضَّرُورَةِ حَالِلٌ))

[المحلیٰ باآثار لابن حزم: ج ۱۴ ص ۳۵۷]

”ہر وہ چیز جس کی حرمت بیان نہیں ہوئی وہ اس قرآنی نص کے مطابق حلال ہے، کیونکہ دین میں یا تو فرض ہیں یا حلال یا حرام، جو فرض ہیں قرآن و سنت میں نام لے کر ان کا حکم دیا گیا ہے جو حرام ہیں ان کی تفصیل بھی موجود ہے ان دونوں کے علاوہ جو نہ فرض ہیں نہ حرام وہ بداہتاً حلال ہیں۔“

دوسرا شبہ:

بعض حضرات یہ سوال بھی اٹھاتے ہیں کہ:

”بہت سے ایسے معاملات ہیں جو دورِ حاضر میں معاشرتی زندگی کا لازمی حصہ بن چکے ہیں لیکن عہد رسالت میں ان کا ذکر تک نہیں ملتا اور نہ کتب حدیث و فقہ میں ان کا کوئی تذکرہ ہے پھر یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ اسلام میں ضرورت زندگی کے ہر مسئلہ کا حل موجود ہے۔؟“

ہماری رائے میں یہ تسلیم کر لینے کے بعد کہ معاملات میں اصل اباحت ہے یہ سوال بالکل بے معنی ہے کیونکہ اس اصول کے مطابق لین دین کی ہر وہ صورت جائز ہوگی جس سے

شریعت نے منع نہ کیا ہو۔

یہاں یہ بات بھی یاد رکھیے کہ اس کا یہ معنی ہرگز نہیں کہ جس چیز کا نام لے کر اسلام نے منع نہ کیا ہو وہ جائز ہے بلکہ اس کا مطلب صرف اتنا ہے کہ لین دین کی ہر وہ شکل جو اسلام کے بیان کردہ اصول اور مقاصد شریعت کے خلاف نہ ہو وہ جائز ہے۔

ہمارے خیال میں کوئی ایسا نیا مسئلہ موجود نہیں جو انسانی زندگی کے لیے ضروری ہو لیکن قرآن و حدیث کی اصولی ہدایات، مقاصد شریعت اور فقہی قواعد کی روشنی میں اس کا حل ممکن نہ ہو! عہد رسالت کے بعد پیدا ہونے والے مسائل کے متعلق صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تابعین عظام، محدثین فقہاء اور علمائے اسلام رضی اللہ عنہم کے فتاویٰ اس کا واضح ثبوت ہیں۔

### خلاصہ

✽ قرآن و حدیث کی اصولی ہدایات اور مقاصد شریعت کی روشنی میں ہر مسئلہ کا حل ممکن ہے۔



## مالی معاملات کے بنیادی اصول

شریعت نے جن مالی معاملات کو ممنوع قرار دیا ہے اگر گہری نظر سے ان کا تجزیہ کیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ جس چیز سے شرعی طور پر فائدہ حاصل کیا جاسکتا ہو اور وہ انسان کی ملکیت و قبضہ میں ہو دو اصولوں کی پابندی کے ساتھ اس کا دوسرے کے ساتھ معاملہ کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ معاملہ ربا (سود) سے پاک ہو۔

۲۔ غَرَر (Uncertainty) پر مشتمل نہ ہو۔

بشرطیکہ ممانعت کی کوئی خارجی وجہ نہ پائی جا رہی ہو یا ایک عقد (Contract) میں دو عقد یا دو شرطیں جمع نہ ہوں یا ایسی شرط نہ لگائی گئی ہو جو طے شدہ معاملہ کے تقاضوں کے خلاف ہو۔

علاوہ ازیں خرید و فروخت اور قرض کا معاملہ بھی جمع نہیں ہو سکتے یعنی قرض دینے کی شرط پر چیز خریدنا یا قرض دینے کے بدلے خریدنے کی شرط لگانا جائز نہیں۔

شراب، مردار، خنزیر اور بتوں کی تجارت حرام ہے کیونکہ شرعاً ان چیزوں سے فائدہ حاصل کرنا درست نہیں۔ ایک شخص کے طے کیے ہوئے سودے پر سودا کرنا منع ہے کہ ان میں ممانعت کی خارجی وجہ پائی جاتی ہے وہ ہے دو افراد کے درمیان اختلاف پیدا ہونے کا اندیشہ۔ فی نفسہ بیع میں کوئی خرابی نہیں۔

چنانچہ علامہ ابن العربی رحمۃ اللہ علیہ کا رو بار کی ممنوعہ صورتوں کا تذکرہ کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

((ولا تخرج عن ثلاثة اقسام؛ وهي الربا والباطل والغرر

ویرجع الغرر بالتحقیق الی الباطل فیکون قسمین علی  
 (الآیتین) [احکام القرآن: ج ۱ ص ۲۶۴]

”یہ سب تین قسموں میں شامل ہے اور وہ تین قسمیں یہ ہیں: (۱) سود۔ (۲) باطل  
 طریقے سے مال کمانا۔ (۳) غرر۔ حقیقت میں غرر بھی باطل طریقے سے مال کمانے  
 میں شامل ہے یوں دو آیتوں کے مطابق دو قسمیں ہی بنتی ہیں۔“

فقہائے اہل سنت نے بیع کے جو ضوابط بیان فرمائے ہیں ان کی بنیاد یہی اصول  
 ہیں۔ ذیل میں اختصار کے ساتھ سود اور غرر کے متعلق ضروری باتیں بیان کی جاتی ہیں۔  
 ربا (سود):

سرمایہ دارانہ نظام میں تجارت اور ربا کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ سرمایہ دار کے  
 نزدیک اقتصادی سرگرمیوں کے لیے ربا ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے لیکن اسلام  
 جس طرح کا عادلانہ اور منصفانہ معاشرہ قائم کرنا چاہتا ہے وہ ربا کی موجودگی میں ممکن نہیں،  
 خواہ وہ ذاتی قرضوں پر لیا جائے یا تجارتی قرضوں پر۔ کیونکہ ربا سے جو ذہنیت پرورش  
 پاتی ہے وہ قدم بہ قدم اسلام سے ٹکراتی ہے۔ یہ معاشرے کے مختلف طبقات میں عداوت  
 کا باعث بنتا ہے۔ غریبوں پر صریح ظلم اور لوگوں کا مال باطل طریقے سے کھانے کی بیج  
 ترین شکل ہے۔ اس لیے اسلام نے اس کو حرام قرار دیا ہے اور اسے کبیرہ گناہوں میں شمار  
 کیا ہے اللہ تعالیٰ نے اس کے مرتکب کے ساتھ اعلان جنگ فرمایا ہے، لہذا لہین دین کی ہر  
 وہ صورت ناجائز ہے جس میں ربا کا عنصر پایا جائے۔

ذیل میں ربا کے متعلق قرآن کی بعض آیات اور نبی ﷺ کی احادیث ملاحظہ ہوں۔

﴿الَّذِينَ يَأْكُلُونَ الرِّبَا لَا يَقُومُونَ إِلَّا كَمَا يَقُومُ الَّذِي  
 يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطَانُ مِنَ الْمَسِّ ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا إِنَّمَا الْبَيْعُ  
 مِثْلُ الرِّبَا وَأَحَلَّ اللَّهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا فَمَنْ جَاءَهُ  
 مَوْعِظَةٌ مِنْ رَبِّهِ فَانْتَهَى فَلَهُ مَا سَلَفَ وَأَمْرُهُ إِلَى اللَّهِ وَمَنْ

عَادَ فَأَوْلَيْكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ۝ يَمْحَقُ  
اللَّهُ الرَّبْوَا وَيُرْبِي الصَّدَقَاتِ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ أَثِيمٍ ۝ ﴿

[البقرة: ۲۷۶، ۲۷۵]

”جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ یوں کھڑے ہوں گے جیسے شیطان نے کسی شخص کو چھو کر  
مخبوط الحواس بنا دیا ہو۔ اس کی وجہ ان کا یہ قول ہے کہ تجارت بھی تو آخر سود کی طرح  
ہے، حالانکہ اللہ نے تجارت کو حلال قرار دیا ہے اور سود کو حرام، اب جس شخص کو اس  
کے رب کی طرف سے یہ نصیحت پہنچ گئی اور وہ سود سے رک جائے تو پہلے جو سود کھا  
چکا اس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے مگر جو پھر بھی سود کھائے تو یہی لوگ دوزخی ہیں،  
جس میں ہمیشہ رہیں گے اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتا ہے اور صدقات کی پرورش کرتا ہے اور  
اللہ تعالیٰ کسی ناشکرے بندے کو پسند نہیں کرتا۔“

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا الرِّبْوَا أَضْعَافًا مُضَاعَفَةً  
وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ﴾ [آل عمران: ۱۳۰]

”اے ایمان والو! سود کو دگنا چوگنا کر کے مت کھاؤ اور اللہ سے ڈرتے رہو تا کہ تم  
آخرت میں نجات پاسکو۔“

((اجْتَنِبُوا السَّبْعَ الْمُؤْبَقَاتِ قَالُوا يَا رَسُولَ اللَّهِ وَمَا هُنَّ قَالَ  
الشَّرْكَ بِاللَّهِ وَالسَّحْرُ وَقَتْلُ النَّفْسِ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ  
وَأَكْلُ الرِّبْوَا وَأَكْلُ مَالِ الْيَتِيمِ وَالتَّوَلَّى يَوْمَ الزَّحْفِ وَقَذْفُ  
الْمُحْصَنَاتِ الْمُؤْمِنَاتِ الْغَافِلَاتِ)) [صحيح بخاری: كتاب

الوصايا، باب قول الله تعالى ان الذين ياكلون ..... الخ]

”سات مہلک گناہوں سے بچو صحابہ (رضی اللہ عنہم) نے پوچھا اللہ کے نبی (ﷺ) وہ کون  
سے گناہ ہیں؟ آپ (ﷺ) نے فرمایا: اللہ کے ساتھ شریک کرنا، جادو کرنا، جس  
نفس کو اللہ نے حرام کیا ہے اس کو ناحق قتل کرنا، سود کھانا، یتیم کا مال کھانا، جنگ کے



دن پیٹھ دکھا کر بھاگنا، پاک دامن اور بھولی بھالی عورتوں پر تہمت لگانا۔“  
 ((قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دِرْهَمٌ رِبَاً يَأْكُلُهُ الرَّجُلُ  
 وَهُوَ يَعْلَمُ أَشَدُّ مِنْ سِتَّةٍ وَثَلَاثِينَ زَنِيَةً)) [مسند احمد: ۲۰۹۵۱]  
 ”ربا کا ایک درہم جو انسان علم ہونے کے باوجود کھاتا ہے ۳۶ (چھتیس)  
 زناؤں سے زیادہ سخت ہے۔“

((الربا ثلاثة وسبعون بابا، أيسرها مثل أن ينكح الرجل أمه))  
 [مستدرک حاکم: کتاب البيوع]

”سود کے ستر دروازے ہیں سب سے ہلکا یہ ہے کہ انسان اپنی ماں کے  
 ساتھ نکاح کرے۔“

اس لیے نبی ﷺ نے اس میں ملوث تمام لوگوں کو لعنتی قرار دیا ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ  
 سے مروی ہے۔

((لَعَنَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَكِلَ الرِّبَا وَمُؤْكِلَهُ  
 وَكَاتِبَهُ وَشَاهِدِيَهُ وَقَالَ هُمْ سَوَاءٌ)) [صحيح مسلم: کتاب  
 المساقاة، باب لعن اكل الربا وموكله]

”نبی کریم ﷺ نے سود کھانے، سود کھلانے، لکھنے والے اور اس کے گواہوں پر  
 لعنت فرمائی ہے اور فرمایا یہ سب گناہ میں برابر کے شریک ہیں۔“  
 سود کی حرمت پر اجماع ہے:  
 علامہ ابن قدامہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

((كل قرض شرط فيه ان يزيده فهو حرام بغير خلاف))

[المغنی: ج ۹: ص ۱۰۴]

”ہر وہ قرض جس میں اضافے کی شرط ہو وہ بلا اختلاف حرام ہے۔“

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((وقد اتفق العلماء على ان المقرض متى اشترط زيادة على

قرضہ کان ذلك حرام)) [مجموع الفتاوی: ج ۲۹ ص ۳۳۴]  
 ”سب علماء اس بات پر متفق ہیں کہ قرض دینے والا جب اپنے قرض پر اضافے کی  
 شرط لگائے تو یہ حرام ہوگا۔“

علامہ ماوردی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں:

(( اجمع المسلمون علی تحريم الربا وعلی انه من الكبائر))

[عمدة القاری: ج ۱ ص ۲۰۰]

”سود کی حرمت اور اس کے کبیرہ گناہ ہونے پر مسلمانوں کا اجماع ہے۔“

ربا ایک وسیع الذیل موضوع ہے۔ یہاں اس کے تمام پہلوؤں کا احاطہ ممکن  
 نہیں اس لیے ہم صرف اس کی تعریف اور قسمیں ذکر کرنے پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔

ربا کا معنی و مفہوم:

عربی لغت میں ربا کا معنی ہے:

(الفضل، الزيادة، النماء)

”زائد، زیادتی اور نمو۔“

اصطلاح میں ربا کا لفظ دو معنوں کے لیے آتا ہے:

۱۔ قرض یا دین (Debt) کی اصل رقم پر جو زائد رقم بطور شرط یا معاہدہ لی جائے یا ایک

جنس کی دو چیزوں کا اس طرح تبادلہ کیا جائے کہ دونوں یا ایک طرف سے ادھار

ہو۔ اس کو ربا النسیئة کہا جاتا ہے۔

۲۔ ایک طرح کی دو چیزوں کا کمی بیشی سے تبادلہ یہ ربا الفضل کہلاتا ہے۔

علامہ ڈاکٹر عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

((وهناك من العلماء من يرى ان الربا اسم يقع على كل البيوع

(المحرمة)) [الربا والمعاملات المصرفية في نظر الشريعة الاسلامية: ص ۴۴]

”بعض علماء کے خیال میں خرید و فروخت کی تمام حرام شکلوں پر ربا کا اطلاق ہوتا ہے۔“

### قرآن کی روشنی میں ربا الفضل کا حکم:

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

((فَإِنَّهُ يَتَنَاوَلُ كُلَّ مَا نَهَى عَنْهُ مِنْ رَبَا النِّسَاءِ وَرَبَا الْفَضْلِ وَالْقَرْضِ الَّذِي يَجْرُ مَنْفَعَةً وَغَيْرَ ذَلِكَ))

”ربا کا لفظ ربا النسائية، ربا الفضل اور جو قرض نفع کا باعث بنے سب کو شامل ہے۔“

### احادیث میں ربا الفضل کا حکم:

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا:

((يَنْهَى عَنْ بَيْعِ الذَّهَبِ بِالذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ بِالْفِضَّةِ وَالْبُرِّ بِالْبُرِّ وَالشَّعِيرِ بِالشَّعِيرِ وَالتَّمْرِ بِالتَّمْرِ وَالمِلْحِ بِالمِلْحِ إِلَّا سَوَاءً بِسَوَاءٍ عَيْنًا بَعَيْنٍ فَمَنْ زَادَ أَوْ أزدَادَ فَقَدْ أربى فَرَدَّ النَّاسُ مَا أَخذُوا))

[صحیح مسلم: کتاب المساقات، باب الصرف وبيع

الذهب بالورق نقدا]

”آپ صلی اللہ علیہ وسلم سونے کی سونے کے ساتھ، چاندی کی چاندی کے ساتھ گندم کی گندم

کے ساتھ جو کی جو کے ساتھ کھجور کی کھجور کے ساتھ اور نمک کی نمک کے ساتھ بیچ سے

منع فرماتے تھے الا یہ کہ برابر برابر اور نقد ہوں جو زیادہ لے یا زیادہ دے وہ ربا کا

مرتبک ہوا تو لوگوں نے جو لیا تھا وہ لوٹا دیا۔“

ظاہر ہے ایک جیسی دو چیزوں کے تبادلے کی ضرورت اس وقت پیش آتی ہے جب

ان کی جنس ایک ہونے کے باوجود کوالٹی میں فرق ہو اس صورت میں اسلام نے ہمارے

سامنے دو ہی راستے رکھے ہیں۔

۱۔ جو کم تر چیز کے بدلے اعلیٰ یا اعلیٰ کے بدلے کم تر لینا چاہتا ہے وہ پہلے اس چیز کو بازار میں فروخت کرے اس کے بعد اپنی مطلوبہ چیز خریدے جیسا کہ حدیث میں آیا ہے:

((أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اسْتَعْمَلَ رَجُلًا عَلِيَّ خَيْبَرَ فَجَاءَهُ بِتَمْرٍ جَنِيْبٍ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَكُلْتُ تَمْرٍ خَيْبَرَ هَكَذَا قَالَ لَا وَاللَّهِ يَا رَسُولَ اللَّهِ إِنَّا لَنَأْخُذُ الصَّاعَ مِنْ هَذَا بِالصَّاعَيْنِ وَالصَّاعَيْنِ بِالثَّلَاثَةِ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَفْعَلْ بَعْ الْجَمْعِ بِالذَّرَاهِمِ ثُمَّ ابْتَعْ بِالذَّرَاهِمِ جَنِيْبًا))

[صحیح بخاری: کتاب البیوع، باب اذا اراد بیع تمر بتمر خیر منه]

”نبی ﷺ نے ایک آدمی کو خیبر میں عامل مقرر کیا وہ آپ ﷺ کے پاس بہترین کھجوریں لے کر آیا تو رسول اللہ ﷺ نے پوچھا: کیا خیبر کی تمام کھجوریں اس قسم کی ہیں؟ اس نے جواب دیا: اے اللہ کے رسول ﷺ واللہ ایسی نہیں ہیں ہم دو صاع کے بدلے اس کا ایک صاع اور تین صاع کے بدلے اس کے دو صاع وصول کرتے ہیں آپ ﷺ نے فرمایا ایسا نہ کرو ان ہلکی کھجوروں کو نقد درہموں سے بیچو پھر ان درہموں سے اعلیٰ کھجوریں خریدو اور یہی ہدایت وزن کی جانے والی اشیاء کے متعلق فرمائی۔“

۲۔ اگر یہ ممکن نہ ہو تو دوسری صورت یہ ہے کہ دونوں اشیاء کے مابین خاصیت کے فرق (Quality) کو نظر انداز کر دیا جائے۔

ربا الفضل کیوں حرام ہے؟

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کوالٹی میں فرق کی بنیاد پر کمی بیشی کے ساتھ تبادلے میں بظاہر کوئی خرابی نظر نہیں آتی کیونکہ اعلیٰ درجے اور کم تر درجے کی چیز برابر نہیں پھر شریعت نے اسے کیوں حرام قرار دیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس سے انسان میں سود خوری کی

ذہنیت پرورش پانے کا اندیشہ تھا۔ دین اسلام کا یہ طرہ امتیاز ہے کہ جب وہ کسی چیز کو حرام قرار دیتا ہے تو اس برائی تک پہنچنے کے تمام راستے اور ذرائع بھی بند کر دیتا ہے چنانچہ نبی ﷺ نے اس کی یہ حکمت خود ہی بیان فرمادی ہے۔

(( لَا تَبِيعُوا الدِّينَارَ بِالدِّينَارِ وَلَا الدِّرْهَمَ بِالدِّرْهَمِ وَلَا الصَّاعَ بِالصَّاعِ فَإِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمُ الرَّمَاءَ وَالرَّمَاءُ هُوَ الرَّبَا ))

[مسند احمد: ۶۰۲۵]

”ایک درہم کو دو درہم اور ایک صاع کو دو صاع کے عوض نہ بیچو کیونکہ مجھے خوف ہے کہ کہیں تم سود خوری میں مبتلا نہ ہو جاؤ۔“

دو چیزوں میں تبادلہ کی ممنوعہ صورتیں:

واضح رہے تمام غلہ جات جیسے گندم، چاول اور مکئی اس لحاظ سے ایک جنس ہیں کہ ان کو کھایا جاتا ہے مگر یہ اپنے خاص اوصاف کے اعتبار سے الگ الگ قسمیں ہیں۔ اس لحاظ سے دو چیزوں کے تبادلہ میں جائز اور ممنوعہ صورتیں حسب ذیل ہوں گی:

- ۱۔ دونوں کی جنس اور قسم ایک ہو۔ جیسے گندم کا گندم سے اور چاول کا چاول سے تبادلہ۔
- ۲۔ جنس اور قسم دونوں مختلف ہوں۔ جیسے گندم کا سونے سے تبادلہ۔
- ۳۔ جنس ایک مگر قسم مختلف ہو۔ مثلاً گندم کا مکئی سے یا ڈالر کا روپے سے تبادلہ۔

پہلی صورت میں کمی بیشی بھی منع ہے اور ادھار بھی۔ کیونکہ ایک قسم کی دو چیزوں میں حقیقی مساوات کے لیے یہ ضروری ہے کہ دونوں کی ادائیگی کا وقت بھی ایک ہو۔ دوسری صورت میں کمی بیشی اور ادھار دونوں جائز ہیں۔

تیسری صورت میں کمی بیشی جائز ہے مگر ادھار درست نہیں۔ کیونکہ ادھار کی اجازت سے سود کا دروازہ کھلنے کا اندیشہ ہے۔ مثلاً اسی روپے دیکر سود وصول کرنا سود ہے اب ایک شخص یہ چاہتا ہے کہ وہ اسی دیکر چھ ماہ بعد سود وصول کرے تو وہ یہ حیلہ کر سکتا ہے کہ ضرور تمہند کو اسی روپے دینے کی بجائے چھ مہینے کے لیے ایک ڈالر سو روپے میں بیچ



دے۔ یوں ادھار کی اجازت کو سود حاصل کرنے کا ذریعہ بنا لیتا۔ اس لیے اسلام نے ادھار کی اجازت نہیں دی۔ دونوں جانب سے نقد ہونے کی صورت میں یہ خطرہ نہیں ہے اس لیے نقد ایک ڈالر جتنے کا چاہیں بچیں اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

ربا الفضل کا دائرہ:

جن احادیث میں ربا الفضل کی ممانعت بیان ہوئی ہے ان میں صرف چھ مخصوص چیزوں کا ذکر ہے۔

(۱) سونا	(۲) چاندی	(۳) گندم
(۴) جو	(۵) کھجور	(۶) نمک

بعض روایات میں خشک انگور (منقی) کا ذکر بھی ہے کیا یہ ممانعت صرف انہی چیزوں کے ساتھ خاص ہے یا ان کے علاوہ باقی اشیاء بھی اس میں شامل ہیں؟ اس کے متعلق فقہاء رحمہم کا اختلاف ہے۔

ہماری رائے میں سونے، چاندی میں علت قیمت ہے اور باقی چیزوں میں قابل غذا و ذخیرہ ہونا۔ جہاں یہ علت پائی جائے گی وہاں ایک قسم کی دو چیزوں کا تبادلہ کمی بیشی کے ساتھ ناجائز ہوگا البتہ حدیث میں جانوروں کے متعلق رخصت آئی ہے کہ ایک جانور کی جگہ دو لینا درست ہے۔

یہاں یہ بات بھی یاد رکھیے کہ اگر ہم طلائی زیور کی قیمت سونے کی صورت میں ادا کرنا چاہیں تب بھی زیور کے وزن سے زائد سونا دینا جائز نہ ہوگا لہذا یا تو زیور کا تبادلہ ہم وزن سونے سے ہی کریں گے یا اس کی قیمت کرنسی نوٹوں میں ادا کی جائے گی۔

کیا ربا کی حقیقت واضح نہیں؟

بعض حلقوں کی جانب سے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ قرآن و حدیث میں ربا کی جامع تعریف بیان نہیں ہوئی اس لیے کسی چیز کو ربا قرار دینا ہماری صواب دید پر منحصر ہے ان حضرات کی طرف سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس فرمان کا حوالہ بھی دیا جاتا ہے:

((إِنَّ أَخْرَجَ مَا نَزَّلَتْ آيَةُ الرَّبِّ وَإِنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَبِضَ وَلَمْ يُفَسِّرْهَا لَنَا فَدَعُوا الرَّبَّ وَالرَّيْبَةَ))

[سنن ابن ماجه: كتاب التجارات، باب التغليظ في الربا]

”سب سے آخری آیت جو نازل ہوئی وہ ربا کی آیت ہے اللہ کے نبی ﷺ فوت ہو گئے اور اس کی تفسیر بیان نہ کر سکے لہذا تم ربا بھی اور شک والی چیزیں بھی چھوڑ دو۔“

لیکن درج ذیل وجوہ کے باعث ان حضرات کا استدلال انتہائی کمزور ہے۔

۱۔ قرآن کا اسلوب عام فنی کتب سے بالکل مختلف ہے اس میں کسی چیز کی بھی فقہی اور قانونی تعریف بیان نہیں ہوئی، قرآن نے زنا کو قبیح ترین جرم قرار دیا ہے، شراب اور جوئے کو بھی حرام قرار دیا ہے لیکن ان میں سے کسی کی بھی تعریف بیان نہیں فرمائی، کیا اس استدلال کی بنا پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ چونکہ قرآن نے ان گناہوں کی تشریح نہیں کی، لہذا ان کا مفہوم متعین کرنا ہماری صواب دید پر منحصر ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ قرآن میں ان گناہوں کی تعریف اس لیے بیان نہیں ہوئی کہ یہ سب چیزیں اتنی واضح تھیں کہ بطور خاص ان کی تعریف کی ضرورت ہی نہ تھی، قرآن کے مخاطبین ان کی حقیقت سے پوری طرح واقف تھے۔

۲۔ اللہ تعالیٰ نے ربا کے مرتکب لوگوں کے خلاف اعلان جنگ کیا ہے۔ کیا یہ تصور کیا جاسکتا کہ اللہ نے مبہم غیر متعین عمل جس کی حقیقت ہی معلوم نہ ہو کے ارتکاب پر

اعلان جنگ فرما دیا ہو؟

﴿لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا ۗ﴾ [البقرة: ۲۸۶]

”اللہ تعالیٰ کسی جان کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔“

۳۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے فرمان کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ربا کی حرمت آپ کی زندگی کے

آخری ایام میں نازل ہوئی تھی۔ حالانکہ اس کی حرمت تو اس سے کافی عرصہ پہلے

نازل ہو چکی تھی، غالباً غزوہ احد کے فوراً بعد:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا الرِّبَا أَضْعَافًا مُضَاعَفَةً

وَ اتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ﴾ [آل عمران: ۱۳۰]

”اے ایمان والو! سود کو دوگنا چوگنا کر کے مت کھاؤ اور اللہ سے ڈرتے رہو تا کہ تم آخرت میں نجات پاسکو۔“

اس آیت میں صریحاً ربا کی ممانعت کا حکم ہے یہ آیت غزوہ احد کے فوراً بعد نازل ہوئی تھی بلکہ بعض روایات سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ربا غزوہ احد سے پہلے ہی ممنوع قرار دیا جا چکا تھا۔ مثلاً حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ:

((قَدِمَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَنَحْنُ نَتَّبَعُ هَذَا الْبَيْعَ، فَقَالَ مَا كَانَ يَدًا بِيَدٍ فَلَيْسَ بِهِ بَأْسٌ، وَمَا كَانَ نَسِيئَةً فَلَا يَصْلُحُ))

[صحیح بخاری: کتاب المناقب، باب کیف آخى النبي بين اصحابه]  
”نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ تشریف لائے اور ہم یہ بیع کرتے تھے (ایک مخصوص بیع کی طرف اشارہ ہے) تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو نقد بہ نقد ہو اس میں کوئی حرج نہیں اور جو ادھار ہو وہ درست نہیں۔“

((عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ أَنَّ عَمْرَو بْنَ أَقِيْشٍ كَانَ لَهُ رِبَا فِي الْجَاهِلِيَّةِ فَكَّرَهُ أَنْ يُسْلِمَ حَتَّى يَأْخُذَهُ فَجَاءَ يَوْمَ أُحُدٍ فَقَالَ أَيْنَ بَنُو عَمِّي قَالُوا بِأُحُدٍ قَالَ أَيْنَ فُلَانٌ قَالُوا بِأُحُدٍ قَالَ أَيْنَ فُلَانٌ قَالُوا بِأُحُدٍ فَلَيْسَ لِأُمَّتِهِ وَرَكِبَ فَرَسَهُ ثُمَّ تَوَجَّهَ قِبَلَهُمْ فَلَمَّا رَأَاهُ الْمُسْلِمُونَ قَالُوا: إِلَيْكَ عَنَّا يَا عَمْرُو قَالَ إِنِّي قَدْ آمَنْتُ))  
[ابوداؤد: باب فِيمَنْ يُسْلِمُ وَيُقْتَلُ مَكَانَهُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ عَزَّ وَجَلَّ]

”حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ عمرو بن اقیش رضی اللہ عنہ کا زمانہ جاہلیت میں کسی کے ذمہ سود تھا انہوں نے اس کے وصول کرنے تک اسلام قبول کرنے کو نامناسب سمجھا، وہ جنگ احد کے دن آئے اور پوچھا میرے چچا زاد کہاں ہیں؟ جواب ملا: جنگ احد میں، پوچھا فلاں کہا ہے؟ جواب دیا گیا: احد میں، انہوں نے پوچھا فلاں

کہاں ہے؟ کہاں گیا: احد میں انہوں نے اسلحہ پہنا اور گھوڑے پر سوار ہو کر احد کی طرف روانہ ہو گئے۔ جب مسلمانوں نے انہیں دیکھا تو کہنے لگے: اے عمرو! دور ہو جاؤ، اس پر انہوں نے کہا: میں اسلام لا چکا ہوں۔“

۴۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس فرمان سے ربا کا جواز ثابت کرنا ان کے فرمان مقصود کے صریح خلاف ہے کیونکہ ان کا مقصود یہ ہے کہ صرف واضح ربا ہی سے نہ بچو بلکہ ہر اس معاملے سے بچو جس میں ربا کا شائبہ بھی پایا جائے اس سے ربا کا جواز نکالنا انتہائی درجے کی نادانی ہے۔

صحیحین، سنن ابی داؤد، نسائی، ترمذی اور موطا میں حرمت ربا کے متعلق حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی بعض روایات ملاحظہ فرمائیں:

((الذَّهَبُ بِالذَّهَبِ رِبًا إِلَّا هَاءَ وَهَاءَ وَالْبُرُّ بِالْبُرِّ رِبًا إِلَّا هَاءَ وَهَاءَ وَالتَّمْرُ بِالتَّمْرِ رِبًا إِلَّا هَاءَ وَهَاءَ وَالشَّعِيرُ بِالشَّعِيرِ رِبًا إِلَّا هَاءَ وَهَاءَ)) [بخاری: کتاب البیوع، باب ما یدکر فی بیع الطعام والحکرة]

”سونا سونے کے عوض، گندم گندم کے بدلے، کھجور کھجور کے اور جو جو کے بدلے سود ہے سوائے اس کے کہ برابر برابر اور نقد لین دین ہو۔“

((عَنْ مَالِكِ بْنِ أَوْسِ بْنِ الْحَدَثَانَ النَّصْرِيِّ أَنَّهُ التَّمَسَّ صَرَفًا بِمِائَةِ دِينَارٍ قَالَ فَدَعَانِي طَلْحَةُ بْنُ عُبَيْدِ اللَّهِ فَرَأَوْنَا حَتَّى اصْطَرَفَ مِنِّي وَأَخَذَ الذَّهَبَ يُقَلِّبُهَا فِي يَدِهِ ثُمَّ قَالَ حَتَّى يَأْتِيَنِي خَازِنِي مِنَ الْغَابَةِ . وَعُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ يَسْمَعُ . فَقَالَ عُمَرُ وَاللَّهِ لَا تُفَارِقُهُ حَتَّى تَأْخُذَ مِنْهُ ثُمَّ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الذَّهَبُ بِالْوَرِقِ رِبًا إِلَّا هَاءَ وَهَاءَ وَالْبُرُّ بِالْبُرِّ رِبًا إِلَّا هَاءَ وَهَاءَ وَالتَّمْرُ بِالتَّمْرِ رِبًا إِلَّا هَاءَ وَهَاءَ وَالشَّعِيرُ بِالشَّعِيرِ رِبًا إِلَّا

هَاءَ وَهَاءَ)) [مؤطا امام مالک: باب ماجاء في الصرف، صحيح

بخاری: باب بيع الشعير بالشعير]

”مالک بن اوس بن حدثان نصری سے روایت ہے کہ انہوں نے سو دینار بھنانا چاہے کہتے ہیں مجھے طلحہ بن عبید اللہ نے بلایا، ہم متفق ہو گئے یہاں تک کہ انہوں نے مجھ سے بیع صرف کر لی اور وہ دینار پکڑ کر اپنے ہاتھ میں اچھالنے لگے، پھر کہا غابہ سے میرے خزانچی کے آنے تک انتظار کرو۔ اور عمر بن خطاب رضی اللہ عنہما یہ بات سن رہے تھے۔ انہوں نے کہا جب تک اس سے وصول نہ کر لو اس سے جدا نہ ہونا، پھر عمر رضی اللہ عنہما نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے سونا چاندی کے بدلے سود ہے مگر یہ کہ نقد بنقد ہو، گندم گندم کے بدلے سود ہے مگر یہ کہ برابر اور نقد ہو۔ کھجور کھجور کے بدلے سود ہے مگر یہ کہ برابر اور نقد ہو، جو، جو کے بدلے سود ہے الا کہ برابر اور نقد ہوں۔“

ان دونوں روایتوں سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہما کو ربا کی حرمت اور حقیقت کے متعلق کوئی اشتباہ نہ تھا۔ ان کا اصل شبہہ یہ تھا کہ آیا اس کا دائرہ صرف انہی چیزوں تک محدود ہے جن کا حدیث میں ذکر ہے یا ان کے علاوہ دوسری چیزیں بھی اس میں شامل ہیں؟ اس کی تائید صحیح بخاری کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے۔

((ثَلَاثٌ وَدِدْتُ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمْ يُفَارِقْنَا حَتَّى يَعْهَدَ إِلَيْنَا عَهْدًا الْجَدُّ وَالْكَالَالَةُ وَأَبْوَابٌ مِنْ أَبْوَابِ الرَّبَا))

[صحيح بخاری: كتاب الاشربة، باب ماجاء في ان الخمر ما خامر العقل]

”تین چیزیں ایسی ہیں جن کے متعلق میری خواہش تھی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان کی تفصیل بیان کرنے سے قبل ہم سے جدا نہ ہوتے۔ (۱) دادا کی وراثت کا مسئلہ (۲) کلالہ کی وراثت کا مسئلہ (۳) ربا کے بعض مسائل۔“

یہاں یہ امر بھی ذہن نشیں رہنا چاہیے کہ جس طرح سودی لین دین کی قدیم شکلیں حرام ہیں اسی طرح اس کے جدید صورتیں بھی حرام ہیں۔ لہذا ہر قسم کے انعامی بانڈز، ڈیفنس سرٹیفکیٹس، سیونگ سرٹیفکیٹس، پاکستان انویسٹمنٹ بانڈز اور کمرشل انشورنس کی تمام قسمیں ناجائز ہیں کیونکہ یہ سودی لین دین کے زمرے میں داخل ہیں۔

غَرَرٌ (uncertainty):

دوسرا اصول یہ ہے کہ معاملہ غرر پر مشتمل نہ ہو۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

((النَّهْيُ عَنِ بَيْعِ الْغَرَرِ فَهُوَ أَصْلٌ عَظِيمٌ مِنْ أُصُولِ كِتَابِ

الْبَيْعِ)) [شرح نووی علی مسلم: کتاب البيوع، باب بطلان بيع

الحصاة.....]

”بیع غرر سے ممانعت کتاب البيوع کے اصول میں سے ایک عظیم اصول ہے۔“

اس اصول کی بنیاد وہ آیات ہیں جن میں باطل طریقے سے مال کھانے کی ممانعت

ہے علامہ ابن العربی رحمۃ اللہ علیہ باطل کی تشریح میں فرماتے ہیں:

”اس میں خرید و فروخت کی وہ تمام صورتیں شامل ہیں جو شرعاً حلال نہیں اور مقصود

کے لیے مفید نہیں ہیں کیونکہ شریعت نے ان سے منع کیا ہے اور ان کے لین دین کو

حرام قرار دیا ہے جیسے سود، غرر وغیرہ ہیں۔“ [احکام القرآن: ج ۱ ص ۱۱۱]

غرر کے متعلق ذیل کی احادیث ملاحظہ فرمائیں:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

((نَهَى رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ بَيْعِ الْحَصَاةِ وَعَنْ

بَيْعِ الْغَرْرِ)) [صحیح مسلم: کتاب البيوع، باب بطلان بيع الحصاة]

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کنکری کی بیع اور بیع غرر سے منع فرمایا۔“

سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ تابعی کہتے ہیں:

((أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهَى عَنْ بَيْعِ الْغَرْرِ))

[موطا امام مالك: کتاب البيوع، باب بيع الغرر]

”بلاشبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیع غرر سے منع فرمایا۔“

آخری روایت مرسل ہے جو سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ تابعی براہ راست نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کر رہے ہیں۔ جمہور کے نزدیک ایسی روایت کو دلیل بنانا درست نہیں لیکن چونکہ اوپر کی دو روایتیں اس کی تائید کر رہی ہیں اس لیے ہم نے اس کو بھی یہاں بیان کر دیا ہے۔

غرر کا معنی:

مذکورہ بالا روایات میں معاملے کے غرر سے پاک ہونے کو بطور ایک اصول کے بیان کیا گیا ہے احادیث میں جن بیوع کے نام لے کر منع کیا گیا ہے ان میں سے بیشتر کی وجہ غرر ہی ہے۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ لغت اور علمائے حدیث و فقہ کے حوالے سے غرر کی حقیقت بھی واضح کر دی جائے۔

لغت میں غرر کا معنی دھوکہ دینا، غلط امید دلانا ہے:

جب مالی لین دین کا کوئی معاملہ اس طریقے سے کیا جائے کہ اس میں ابہام یا غیر یقینی کیفیت پائی جائے تو اس کو شرعی اصطلاح میں غرر کہا جاتا ہے۔ چنانچہ علامہ ابن اثیر رضی اللہ عنہ غرر کی تعریف میں رقم طراز ہیں:

((هُوَ مَا كَانَ لَهُ ظَاهِرٌ يَغُرُّ الْمُشْتَرِيَ وَبَاطِنٌ مَجْهُولٌ))

[النهاية: ج ۳ ص ۶۶۱]

”جس کا ظاہر خریدار کو دھوکہ دے اور باطن معلوم نہ ہو۔“

المعجم الوسيط میں ہے:

((بيع الغرر بيع ما يجهله المتبايعان او مالا يتوثق بتسلمه))

”وہ بیع جس سے دونوں بیع کرنے والے ناواقف ہوں یا اس کے حوالے کرنے کا

یقین نہ ہو، بیع غرر ہے۔“

ازہری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

”بیع غرر میں وہ تمام بیوع داخل ہیں جن کی حقیقت سے بیع کرنے والے

ناواقف ہوں۔“ [لسان العرب]



علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ ابن عرفہ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

((الغرر هو ما كان ظاهره يغرر وباطنه مجهول)) [عمدة القاری

شرح صحیح بخاری: ج ۱۷ ص ۴۷۱]

”جس کا ظاہر دھوکے میں مبتلا کرے مگر اس کا باطن معلوم نہ ہو۔“

نیز صاحب مشارق کے حوالے سے لکھتے ہیں:

”بیع غرر مخاطره کو کہتے ہیں بیع مخاطره وہ ہے جس میں قیمت یا چیز یا اس کا سلامت

ہونا یا اس کی مدت واضح نہ ہو۔“

نامور محدث امام خطابی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

((كل بيع كان المقصود منه مجهولا غير معلوم ومعجوزا عنه

غير مقدور عليه فهو غرر وذلك مثل ان يبيعه سمكا في الماء

او طيرا في الهواء لؤلؤا في البحر او عبدا ابقا او جملا شاردا

او ثوبا في جراب لم يره ولم ينشره او طعاما في بيت لم يفتحه

او ولد بهيمة لم تولد او ثمر شجرة لم تثمر وفي نحوها من

الامور التي لا تعلم ولا يدري هل تكون ام لا فان البيع فيها

مفسوخ وانما نهى صلى الله عليه وسلم عن هذه البيوع تحصينا

للاموال ان تضيع وقطعا للخصومة والنزاع ان يقعا بين الناس

فيها وابواب الغرر كثيرة وجماعها ما دخل في المقصود منه

الجهل)) [معالم السنن: ج ۳ ص ۶۷۲]

”ہر وہ بیع جس میں مقصود مجہول، نامعلوم اور دائرہ قدرت سے باہر ہے وہ غرر ہے

اس کی مثال پانی میں مچھلی، ہوا میں پرندے سمندر میں لؤلؤ، بھاگے ہوئے غلام،

پھرے ہوئے اونٹ، تھیلی میں بند کپڑے، جنہیں دیکھنا نہ گیا ہو یا مقفل کمرے

میں غلہ، جانور کا ایسا بچہ جو ابھی پیدا نہ ہوا ہو، درخت کے ایسے پھل جو ابھی وجود میں

نہ آئے ہوں اور اس طرح کی دوسری چیزیں جو نامعلوم ہوتی ہیں اور جن کے متعلق یہ علم نہیں ہوتا کہ ہوں گی یا نہیں تو اس کی خرید و فروخت منع ہے۔ نبی ﷺ نے ایسی خرید و فروخت سے منع فرمایا ہے تاکہ لوگوں کے مال ضائع ہونے سے محفوظ رہیں اور لوگوں کے درمیان جھگڑا پیدا نہ ہو۔ غرر کے ابواب بہت زیادہ ہیں اور ان کے لب لباب یہ ہے کہ جہاں مقصود میں جہالت آجائے وہ غرر ہے۔“

امام نووی رحمہ اللہ رقم طراز ہیں:

((وَيَدْخُلُ فِيهِ مَسَائِلٌ كَثِيرَةٌ غَيْرُ مُنْحَصِرَةٍ كَبَيْعِ الْأَبِقِ وَالْمَعْدُومِ وَالْمَجْهُولِ وَمَا لَا يَقْدِرُ عَلَى تَسْلِيمِهِ وَمَا لَمْ يَتِمَّ مِلْكُ الْبَائِعِ عَلَيْهِ وَيَبِّعَ السَّمَكِ فِي الْمَاءِ الْكَثِيرِ وَاللَّبَنِ فِي الضَّرْعِ وَيَبِّعَ الْحَمْلَ فِي الْبَطْنِ وَيَبِّعَ بَعْضَ الصُّبْرَةِ مُبْهَمًا وَيَبِّعَ ثَوْبًا مِنْ أَلْوَابِ وَشَاةٍ مِنْ شِيَاهِ وَنَظَائِرِ ذَلِكَ، وَكُلُّ هَذَا يَبِّعُهُ بَاطِلٌ لِأَنَّهُ غَرَّرَ مِنْ غَيْرِ حَاجَةٍ)) [شرح نووی علی مسلم: کتاب

البيوع، باب بطلان بيع الحصة]

”اس بیع غرر میں بہت سے مسائل داخل ہیں جیسے بھاگے ہوئے غلام، معدوم و مجہول اور اس کی فروخت جس کو حوالے کرنے کی قدرت نہ ہو اور جس پر بیچنے والے کی ملکیت نہ ہو کثیر پانی میں مچھلی، جانور کے تھنوں میں دودھ، حمل، ڈھیر کے کچھ حصہ کی، مبہم کپڑوں میں سے کسی ایک کپڑے اور بکریوں میں سے کسی ایک بکری کی اور اس طرح کی دیگر چیزوں کی فروخت تو یہ سب باطل ہیں کیونکہ یہ ایسا غرر ہے جس کی ضرورت نہیں۔“

مزید لکھتے ہیں:

((وَأَعْلَمُ أَنَّ بَيْعَ الْمَلَامَسَةِ وَيَبِّعَ الْمُنَابَذَةَ وَيَبِّعُ حَبْلَ الْحَبْلَةِ وَيَبِّعُ الْحَصَاةَ وَعَسْبَ الْفَحْلِ وَأَشْبَاهَهَا مِنَ الْبُيُوعِ الَّتِي جَاءَتْ فِيهَا نُصُوصُ

خَاصَّةٌ هِيَ دَاخِلَةٌ فِي النَّهْيِ عَنِ بَيْعِ الْغَرَرِ وَلَكِنْ أُفْرِدَتْ بِبِالذِّكْرِ،  
وَنَهْيَ عَنْهَا لِكَوْنِهَا مِنْ بَيَاعَاتِ الْجَاهِلِيَّةِ الْمَشْهُورَةِ وَاللَّهُ أَعْلَمُ))

[شرح نووی علی مسلم: کتاب البیوع، باب بطلان بیع الحصة]  
”جان لو! بیع ملامسہ، منابذہ، جبل الحبلہ، بیع حصة، عسب فحل اور اس طرح کی دوسری بیوع جن کے متعلق خاص نصوص وارد ہیں وہ بیع غرر کی ممانعت میں داخل ہیں لیکن اس کا الگ ذکر اس لیے کیا گیا ہے کہ یہ جاہلیت کی مشہور بیوع میں سے ہیں۔“  
شارح بخاری علامہ ابن بطلال کہتے ہیں:

((وقد ذكرنا ان الغرر هو ما يجوز ان يوجد وان لا يوجد))

[شرح بخاری ابن بطلال: ج ۱ ص ۲۸۲]

”ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ غرر وہ ہے جس کے ہونے اور نہ ہونے دونوں کا احتمال ہو۔“  
حافظ ابن قیم رحمہ اللہ غرر کی تشریح میں لکھتے ہیں:

((وهذا كبيع العبد الأبق الذي لا يقدر على تسليمه والفرس الشارد والطير في الهواء..... ونحو ذلك مما لا يعلم حصوله او لا يقدر على تسليمه او لا يعرف حقيقته ومقداره ومنه بيع جبل الحبله..... ومنه بيع الملامسة والمنابذة)) [زاد المعاد، بیع الغرر: ج ۵ ص ۷۲۵]

”اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جس چیز کو حوالے نہ کیا جاسکتا ہو یا جس کی حقیقت اور مقدار معلوم نہ ہو وہ بیع غرر میں شامل ہے۔ بیع جبل الحبلہ، ملامسہ، منابذہ اسی نوعیت کی ہے۔“  
امام الہند شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((وهو الذي يتيقن انه موجود او لا)) [حجة البالغة: ج ۲ ص ۱۹۴]  
”جس کے ہونے یا نہ ہونے کا یقین نہ ہو۔“

شارح ترمذی علامہ مبارک پوری رحمہ اللہ غرر کی تشریح میں رقم طراز ہیں:  
((مَا لَا يُعْلَمُ عَاقِبَتُهُ مِنَ الْخَطَرِ الَّذِي لَا يُدْرَى أَيْكُونُ أَمْ

لَا كَيْبِعًا لِأَبَقِ وَالطَّيْرِ فِي الْهَوَاءِ وَالسَّمَكِ فِي الْمَاءِ ، وَالْغَائِبِ الْمَجْهُولِ وَمُجْمَلُهُ أَنْ يَكُونَ الْمَعْقُودُ عَلَيْهِ مَجْهُولًا أَوْ مَعْجُوزًا (عَنْهُ) [تحفة الاحوذى: ابواب البيوع، باب ماجاء فى كراهية بيع الغرر]

”اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جہاں مقصود معلوم نہ ہو یا حوالے نہ کیا جاسکتا ہو تو وہ غرر ہے۔“

مذکورہ بالا تفصیل سے تین باتیں واضح ہوتی ہیں:

۱۔ پہلی بات تو یہ ثابت ہوتی ہے کہ لغت میں علمائے حدیث و فقہ کے ہاں غرر کا لفظ بڑا وسیع مفہوم رکھتا ہے۔ ایک حدیث میں پانی میں مچھلی کی بیج کو بھی غرر قرار دیا گیا ہے۔

(( لا تشتروا السمك فى الماء فانه غرر )) [مسند احمد]

”پانی میں موجود مچھلی نہ خریدو کیونکہ یہ غرر ہے۔“

۲۔ دوسری بات یہ ثابت ہوتی ہے کہ جو چیز خریدار کے حوالے نہ کی جاسکتی ہو یا جس مالی سودے میں ابہام یا غیر یقینی کیفیت پائی جائے اس کا لین دین درست نہیں۔ خواہ ابہام خود اس چیز میں ہو یا اس کی جنس، نوع، صنف، مقدار، قیمت، مدت عقد کے الفاظ میں۔

بیع کی درج ذیل اقسام اس ابہام کی وجہ سے ہی ناجائز ہیں۔

❁ بیعتین فی بیعة: ایک بیع میں دو بیعتیں یعنی فروخت کرنے والا یہ کہے: ”یہ چیز نقد سو کی اور ادھار ایک سو دس کی بشرطیکہ کسی ایک قیمت کا تعین نہ ہو۔“ اس صورت میں چونکہ قیمت مبہم رہتی اس لیے یہ ناجائز ہے۔

❁ بیع الحصة: یہ کہنا کہ: ”میں یہ کنکری پھینکتا ہوں یہ جس کپڑے پر پڑے میں وہ کپڑا آپ کو اتنے کا فروخت کرتا ہوں یا یہ کہنا کہ یہ کنکری یہاں سے جہاں تک جائے وہ زمین اتنی قیمت میں فروخت کرتا ہوں۔“ یہاں چونکہ کپڑا اور زمین مبہم ہے اس لیے شریعت نے اس سے منع کیا ہے۔

❁ بیع ملامتہ: صرف خریدار کے چیز کو ہاتھ لگانے سے بیع مکمل ہو جائے دیکھنے کی اجازت نہ ہو۔ اس صورت میں فروخت کی جانے والی چیز کی صفات مبہم ہوتی ہیں

اس لیے یہ بھی ممنوع ہے۔

❁ بیع مُنَابَذَه: فریقین میں سے ہر ایک اپنی اپنی چیز پھینکے اور یہ پھینکنا ہی فروخت قرار پائے۔

❁ بیع مُعَلَّق (Contingent Sale) اس میں ملکیت کا ثبوت کسی ایسے واقعہ سے جوڑا گیا ہو جس کے ہونے اور نہ ہونے دونوں کا احتمال ہو۔ اس صورت میں چونکہ بیع غیر یقینی ہوتا ہے اس لیے یہ درست نہیں۔ قمار، لائٹری، اور انشورنس اسی قسم سے تعلق رکھتی ہیں۔

۳۔ اس تفصیل سے تیسری بات یہ ثابت ہوتی ہے کہ تجارت کی نہ معلوم تمام اقسام غرر میں شامل ہیں البتہ بعض علماء جہالت کو غرر سے الگ بھی قرار دیتے ہیں۔  
غرر کا دائرہ:

حدیث اور فقہاء کے کلام میں جہاں غرر کی ممانعت آئی ہے وہ اگرچہ خرید و فروخت کے متعلق ہے لیکن فقہاء نے دوسرے مالی معاملات (از قسم معاوضات) کو بھی اس پر قیاس کر کے ان کے غرر سے پاک ہونے کی شرط لگائی ہے۔

مشکوٰۃ معاملات سے بھی پرہیز ضروری ہے:

مزید برآں ان معاملات سے بھی بچنے کا حکم ہے جو شریعت کے ایک اصول کی روشنی میں تو جائز مگر کسی دوسرے اصول کی روشنی میں ناجائز ہوتے ہیں۔ اس موضوع کی بعض احادیث ملاحظہ ہوں۔

❁ حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا:

((الْحَلَالُ بَيْنَ وَالْحَرَامِ بَيْنٌ، وَبَيْنَهُمَا مُشَبَّهَاتٌ لَا يَعْلَمُهَا كَثِيرٌ مِّنَ النَّاسِ، فَمَنِ اتَّقَى الْمُشَبَّهَاتِ اسْتَبْرَأَ لِدِينِهِ وَعَرْضِهِ، وَمَنْ

وَقَعَ فِي الشُّبُهَاتِ كِرَاعٌ يَرُوعَى حَوْلَ الْحِمَى ، يُوشِكُ أَنْ يُوَاقِعَهُ ))  
[صحیح البخاری: کتاب الایمان، باب فضل من استبرأ لدينه]

”حلال بھی واضح ہے اور حرام بھی واضح ہے اور ان کے درمیان کچھ مشتبہ امور ہیں جن کو اکثر لوگ نہیں جانتے۔ جو شخص شبہات سے بچا اس نے اپنا دین اور عزت بچالی۔ اور جو شبہات میں پڑ گیا اس کی مثال اس چرواہے کی ہے جو (شاہی) چراگاہ کے قریب اپنے جانور چراتا ہے، قریب ہے جانور اس میں داخل ہو جائیں۔“

✽ حضرت عطیہ سعدی رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(( لَا يَبْلُغُ الْعَبْدُ أَنْ يَكُونَ مِنَ الْمُتَّقِينَ حَتَّى يَدَعَ مَا لَا بَأْسَ بِهِ

حَذْرًا لِمَا بِهِ الْبَأْسُ )) [سنن ترمذی: باب لا يبلغ العبد أن

”بندہ اس وقت تک متقی نہیں بن سکتا جب تک حرج والی چیزوں کے خوف سے وہ

چیزیں بھی نہ چھوڑ دے جن میں کوئی حرج نہیں۔“

یہ دونوں احادیث اس امر کا واضح ثبوت ہیں کہ صریح حرام کے علاوہ مشتبہ معاملات سے بھی اجتناب کرنا چاہیے کیونکہ اس طرح حرام میں مبتلا ہونے کا اندیشہ نہیں رہتا۔ اور یہی تقویٰ کا تقاضا ہے۔

### خلاصہ

✽ جس چیز سے فائدہ حاصل کرنا جائز نہ ہو یا انسان کی ملکیت و قبضہ میں نہ ہو اس کی

خرید و فروخت کرنا جائز نہیں۔

✽ خرید و فروخت کی جس صورت میں سود اور غرر کی آمیزش ہو یا ایک ہی معاملہ میں دو

مختلف معاملے جمع ہو رہے ہوں یا شرط فاسد یا دو شرطیں پائی جا رہی ہوں وہ جائز

نہیں ہوگی۔

✽ تقویٰ کا تقاضا یہ ہے کہ مشتبہ معاملات سے بھی بچا جائے۔



## مروجہ معاملات کی تفصیل

جب ہم پیچھے بیان کردہ اصول کی روشنی میں دورِ حاضر کے مالی معاملات کا جائزہ لیتے ہیں تو ان کے جواز یا عدم جواز میں کوئی اشتباہ باقی نہیں رہتا۔ چنانچہ ذیل میں ہم بعض معاملات کا ذکر کرتے ہیں۔

### کریڈٹ کارڈ:

ان میں سرفہرست کریڈٹ کارڈ کا استعمال ہے جو عصرِ حاضر میں ایسی کرنسی کا روپ دھار چکا ہے جو پوری دنیا میں یکساں طور پر استعمال ہو سکتی ہے۔

### کریڈٹ کارڈ کی حقیقت:

کریڈٹ کارڈ کو عربی میں ”بطاقة الائتمان“ کہا جاتا ہے۔ جس کا لغوی معنی ہے ”اعتبار، اعتماد اور قرض کا کارڈ“ جدید معاشی ماہرین کی اصطلاح میں اس سے مراد وہ مخصوص کارڈ ہے جو کسی بینک یا مالیاتی ادارے کی جانب سے کسی شخص یا ادارے کے نام جاری کیا جاتا ہے تاکہ وہ اس کے ذریعے ضروریات زندگی خرید یا نقد رقم بطور قرض حاصل کر سکے۔ اس پر حامل کا نام، تاریخ اجراء و اختتام اور کارڈ کا نمبر وغیرہ لکھا ہوتا ہے۔ اور یہ ایسے سائز اور میٹریل کا ہوتا ہے جو آسانی سے جیب میں رکھا جاسکتا ہے۔ جب حامل اس کے ذریعے خریداری کرتا ہے تو اس کا بل خریداری کی بجائے کارڈ جاری کرنے والا ادارہ کرتا ہے۔ جو بعد میں اس سے وصول یا اس کے اکاؤنٹ سے منہا کر لیا جاتا ہے۔ اگر حامل معینہ مدت کے اندر ادائیگی نہ کر سکے تو اس پر سود وصول کیا جاتا ہے۔ جس کا تعین واجب الاداء رقم کے حساب سے کیا جاتا ہے اور اس کی شرح وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بڑھتی جاتی ہے۔



## کریڈٹ کارڈ کی تاریخ:

بیسویں صدی کا آغاز کریڈٹ کارڈ کا ابتدائی دور ہے۔ کہا جاتا ہے کہ سب سے پہلے کریڈٹ کارڈ کا استعمال ۱۹۱۳ء میں امریکہ میں کیا گیا جو مختلف برانچز (Branches) رکھنے والے ہوٹل اور تیل کمپنیوں نے اپنے گاہکوں کو استعمال کے لیے دیا۔ [البطافات

الدائنية للدكتور محمد بن سعود العصيمي: ص ۲۶]

لیکن اس کا زیادہ استعمال دوسری جنگ عظیم کے بعد اس وقت بڑھا جب مختلف مالیاتی اداروں نے اس کو جاری کرنا شروع کیا۔

۱۹۲۷ء میں The Flat Bus National Bank پہلا بینک ہے جس نے یہ کارڈ جاری کیا۔ ۱۹۵۱ء میں Dinners Club نے پہلا عالم گیر سطح کا کارڈ جاری کیا جو نیویارک میں ہوٹلوں اور دوسرے کاروباری مقامات پر یکساں استعمال ہونے لگا اس کے بعد امریکن ایکسپریس اور Blannch Carte کارڈ سامنے آیا۔ [الخدمات المصرفية للدكتور علاء الدين الزعتري: ص ۵۶۹، ۵۵۹]

۱۹۵۸ء میں بینک آف امریکا نے کیلفورنیا میں Bank Americarad کے نام تبدیل کر کے Viza Card رکھ دیا گیا اور اس کے تحت جاری ہونے والے کارڈ کو ویزا کہا جانے لگا جو اس وقت سب سے مشہور کارڈ شمار ہوتا ہے۔ اس کے بعد جو کارڈ زیادہ تیزی سے پھیلا وہ ماسٹر کارڈ ہے ان کے علاوہ دیگر کارڈ بھی زیر گردش ہیں مگر زیادہ معروف اور زیر استعمال یہی دو ہیں۔

اسلامی ممالک میں اس کا استعمال بیسویں صدی کے آخر میں یعنی ۱۹۹۰ء کے بعد شروع ہوا۔ اس کی بڑھتی ہوئی مانگ کو دیکھتے ہوئے چھوٹے بینک بڑے بینکوں سے تعلقات استوار کرنے لگے تاکہ اس کے استعمال کو وسعت دی جاسکے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس میں سود کا عنصر ۱۹۷۰ء میں داخل کیا گیا۔ اس سے پہلے صرف سروس چارجز

(Service Charges) کے نام پر سالانہ فیس وصول کی جاتی تھی۔

کارڈز کی مختلف قسمیں:

مختلف مالیاتی ادارے اور کمپنیاں اپنے صارفین کی سہولت کے لیے جو کارڈز جاری کرتیں ہیں مختلف اعتبار سے ان کی مختلف قسمیں ہیں لیکن بنیادی قسمیں دو ہی ہیں۔

۱۔ سودی

۲۔ غیر سودی

(۱) سودی:

جن پر تاخیر کی صورت میں جرمانہ عائد ہوتا ہے عام کریڈٹ کارڈ اور چارج کارڈ اسی قسم سے ہیں۔ چارج کارڈ کو عربی میں ”بطاقة الائتمان العادية“ یا ”بطاقة الخصم الشهري“ کہا جاتا ہے اس کارڈ اور کریڈٹ کارڈ میں فرق ہے وہ یہ کہ چارج کارڈ میں مقررہ مدت کے اندر مکمل ادائیگی ضروری ہوتی ہے۔ قسط کی سہولت نہیں ہوتی تاخیر کی صورت میں جرمانہ وصول کرنے کے علاوہ کارڈ بھی منسوخ کر دیا جاتا ہے جبکہ کریڈٹ کارڈ میں پوری رقم یک مشت واپس کرنا ضروری نہیں ہوتی قسط کی سہولت بھی ہوتی ہے تاہم اس پر سود ادائیگی لازم ہوتی ہے۔

(۲) غیر سودی:

اس سے مراد ”Debit Card“ ہے یہ کارڈ صرف اس کو جاری کیا جاتا ہے جس کا اس بینک میں جس سے کارڈ لیا جا رہا ہے بیلنس موجود ہو۔ جب اس کارڈ کے ذریعے خریداری کی جاتی ہے تو اس کے اکاؤنٹ سے اتنی رقم از خود متعلقہ تاجر کے کھاتے میں منتقل ہو جاتی ہے۔ یعنی اس کارڈ کا حامل اصل میں اپنی رقم ہی استعمال کرتا ہے بینک صرف اس پر سروس چارج وصول کرتا ہے۔ ڈیبٹ کارڈ کا حامل اپنے بیلنس سے زائد خریداری نہیں کر سکتا الا کہ بینک کی طرف سے پیشگی اجازت ہو۔ یہ کارڈ عموماً ملک کے اندر ہی استعمال ہوتا ہے۔ اس میں ادائیگی میں تاخیر اور جرمانہ کا اندیشہ نہیں ہوتا۔

## کارڈز کے فوائد:

کارڈز میں تین فریق ہوتے ہیں:

- ۱۔ مالیاتی ادارہ یا بینک جو کارڈ جاری کرتا ہے
- ۲۔ خریداری کے وہ مراکز جہاں کارڈ قبول کیے جاتے ہیں۔
- ۳۔ کارڈ ہولڈر

کارڈ کے استعمال سے تینوں کو فائدہ پہنچتا ہے۔

بینک کو حاصل ہونے والے فوائد:

- \* ممبر شپ فیس: بینکوں کے درمیان سخت مسابقت اور مقابلے کی وجہ سے بعض بینک یہ فیس وصول نہیں کرتے اور مفت کریڈٹ کارڈ فراہم کرتے ہیں۔
- \* سالانہ فیس: جسے بینک کی طرف سے Service Charges کا نام دیا جاتا ہے۔
- \* تاجر سے وصول ہونے والا کمیشن۔
- \* کارڈ گم یا چوری ہو جائے تو نیا کارڈ جاری کرنے کی فیس۔
- \* ادائیگی میں تاخیر کی بنا پر کارڈ ہولڈر سے وصول کی جانے والی اضافی رقم۔

تاجر کا فائدہ:

- \* تجارت کا فروغ: کیونکہ کارڈ ہولڈر خریداری کے لیے انہی مراکز کا رخ کرتے ہیں جو کارڈ قبول کرتے ہیں۔
- \* رقم کی وصولی کا اطمینان۔

کارڈ ہولڈر کو پہنچنے والے فوائد:

- \* رقم جیب میں لے کر گھومنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ اس طرح رقم چوری ہونے یا ضائع ہونے کا خطرہ نہیں ہوتا، کارڈ گم یا چوری ہونے کی صورت میں بینک کو اطلاع کر دی جائے تو کوئی دوسرا استعمال نہیں کر سکتا۔

- ✽ ادائیگی میں آسانی: ایک ماہ سے لے کر ڈیڑھ ماہ تک مہلت مل جاتی ہے۔
- ✽ اگر کارڈ کے ذریعے سفری ٹکٹ خریدا گیا ہو تو حادثے کی صورت میں انشورنس کی سہولت۔

### کارڈز کے نقصانات:

- کارڈز کے کچھ نقصانات بھی ہیں جو صرف کارڈ ہولڈر کے حصہ میں آتے ہیں۔
- ✽ اکثر لوگ بغیر سوچے سمجھے ایسی چیزیں خرید لیتے ہیں جن کی فوری ضرورت نہیں ہوتی ہے اور نہ ہی آئندہ کچھ عرصہ کے لیے خریدنے کے متحمل ہو سکتے ہیں۔ اس طرح بچت کی عادت ختم ہو جاتی ہے اور لوگ قرض تلے دب جاتے ہیں چنانچہ مجموعی لحاظ سے معیشت پر اس کے منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ ایک رپورٹ کے مطابق امریکی اور یورپی عوام میں شاید ہی کوئی ایسا شہری ہو جس نے بینکوں کی قسطیں ادا نہ کرنی ہوں۔ کریڈٹ کارڈ نے ان ترقی یافتہ اقوام کو مقروض اقوام میں بدل دیا ہے۔

- ✽ حامل کارڈ کی خاصی رقم فیس کی نذر ہو جاتی ہے۔ پاکستان میں ”سٹینڈرڈ چارٹرڈ بینک“ نے ”گولڈن ماسٹر کریڈٹ کارڈ“ کی سالانہ فیس ۴۰۰۰ روپے رکھی ہے۔

- ✽ اصل میں یہ ایک سودی معاہدہ ہوتا ہے۔ جس میں شامل ہونا ایک مسلمان کے لیے جائز نہیں۔

- ✽ جن مراکز سے کریڈٹ کارڈ کے ذریعے خریداری کی جاتی ہے وہ عموماً دوسرے کاروباری مراکز سے مہنگے ہوتے ہیں۔

کریڈٹ اور چارج کارڈز کا شرعی حکم:

- اگر کریڈٹ اور چارج کارڈز کی حقیقت پر غور کیا جائے تو ثابت ہوتا ہے کہ یہ دونوں درحقیقت قرض کے کارڈز ہیں، کریڈٹ کارڈ میں طویل مدت کا قرض ہے جبکہ چارج

کارڈ مختصر مدت کا قرض ہوتا ہے۔ چونکہ ان میں تاخیر پر جرمانہ وصول کیا جاتا ہے جو زمانہ جاہلیت کے سود ”اما ان تقفی واما ان تربی“ کے مشابہ ہے۔ جس سے قرآن نے سختی سے روکا ہے۔ لہذا ان کا استعمال شرعاً جائز نہیں ہے۔

علامہ بکر بن عبداللہ ابوزید رضی اللہ عنہ لکھتے ہیں:

((ان بطاقة الائتمان بوضعها العام المعروف عالميا والمحتوية على شروط ومواصفات قطعية التحريم، مثل: غرامات التأخير والخصم الذي يقتضه البنك..... المصدر لها..... من فاتورة التاجر الموقعة من العميل، وتوفير قدر من المنافع لحاملها كالتخفيض، والخدمات الاخرى، هذه)) (البطاقة

الائتمانية) (محرم شرعاً) [بطاقة الائتمان : ص ۵۶]

”بلاشبہ وہ کریڈٹ کارڈ جو عام صورت میں عالمی سطح پر معروف ہے اور جو قطعی حرام شرط اور صفات پر مشتمل ہوتا ہے مثلاً ادائیگی کی تاخیر پر جرمانہ اور وہ کٹوتی جو کارڈ جاری کرنے والا بینک تاجر کے بل جس پر کارڈ ہولڈر کے دستخط ہوتے ہیں سے کرتا ہے اور وہ فوائد جو حامل کو ملتے ہیں جیسے ڈسکاؤنٹ وغیرہ یہ کارڈ شرعی طور پر حرام ہے۔“

بعض علماء کی رائے میں اگر یہ اطمینان کر لیا جائے کہ مقررہ مدت میں ادائیگی کر دی جائے گی تو اس کے استعمال میں کوئی خرابی نہیں۔ لیکن بعض دوسرے علماء کے خیال میں یہ سودی معاہدہ ہے جس کا حصہ بننا جائز نہیں۔

ڈیبٹ کارڈ (Debit Card) کا استعمال جائز ہے:

ڈیبٹ کارڈ کو عربی میں ”بطاقة الحسم الفوری“ کہا جاتا ہے۔ اس میں چونکہ کارڈ ہولڈر اپنا بیلنس ہی استعمال کرتا ہے اس وجہ سے جرمانے کا اندیشہ نہیں ہوتا لہذا اس کے استعمال میں کوئی مضائقہ نہیں۔

چنانچہ علامہ بکر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

((ان كل بطاقة لها غطاء كامل من مال حاملها فلا تسمح  
بالسحب الفوري، ولا التحويل الآلى الا على حسابه، ورصيد ه  
لدى مصدرها، فهي بهذا الوصف جارية على الاصل  
الشرعى: الحل و الجواز)) [بطاقة الائتمان: ص ۵۵]

”ہر وہ کارڈ جس کے پیچھے کارڈ ہولڈر کی رقم بینک میں موجود ہو وہ جب بھی رقم  
نکالے یا خرچ کرے وہ اس کے اپنے کھاتے ہی سے ہو تو یہ شرعی اصول  
(معاملات میں اصل جواز ہے) کے مطابق جائز ہے۔“

بعض علماء کے نزدیک جب کوئی شخص ڈیبٹ کارڈ کے ذریعے خریداری کرتا ہے تو  
وہ دکاندار کو بینک کے حوالے کرتا ہے کہ آپ یہ بل مجھ سے وصول کرنے کی بجائے  
بینک سے وصول پالیں۔ اصطلاح میں اس کو حوالہ کہا جاتا ہے جو جائز ہے۔ نبی ﷺ کا  
ارشاد گرامی ہے:

((اذا تبع احدكم على ملي فليتبع)) [صحيح البخارى كتاب الحوالة]

”جب تم میں سے کسی کو مالدار کے حوالہ کیا جائے تو وہ حوالے ہو جائے“

تاہم بینک کا تاجر سے کمیشن لینا محل نظر ہے۔ بظاہر یہ ڈسکاؤنٹ بل آف ایکسیج  
کے مشابہ ہے کیونکہ بینک تاجر کو کٹوتی کے بعد ادا یگی کرتا ہے یعنی کارڈ ہولڈر سے زیادہ  
وصول کرتا ہے مگر تاجر کو کم ادا کرتا ہے یہی سود ہے۔ بعض حضرات اس کمیشن کو دلالی کی  
اجرت قرار دیتے ہیں لیکن یہ درست نہیں۔ کیونکہ دلالی کا تصور اس سے مختلف ہے۔ دلال  
کسٹمر کو قائل کرتا ہے بینک یہ کام نہیں کرتا۔

انشورنس (التامين):

عصر حاضر میں جو معاملات کثرت سے رائج ہیں ان میں انشورنس بھی ہے جو انسانی  
معاشرے کو اس طرح اپنی لپیٹ میں لے چکی ہے کہ بعض دفعہ انسان نہ چاہتے ہوئے بھی  
قانوناً اس پر مجبور ہو جاتا ہے۔

## انشورنس کی ابتدا:

انشورنس اگرچہ اپنی سادہ شکل میں صدیوں سے رائج ہے لیکن اس نے ایک مضبوط نظام کی صورت انیسویں صدی عیسوی میں اختیار کی۔ اس کے بعد بیسویں صدی اس کی ترقی کا دور ہے جس میں اس کی مروجہ صورتیں سامنے آئیں، ذیل میں ہم اس کے ارتقائی دور کا مختصر خاکہ بیان کرتے ہیں۔

✽ کہا جاتا ہے کہ اس کا ابتدائی تصور بارہویں صدی عیسوی کے آخر میں Bottomry (بحری جہاز پر قرض کا معاہدہ) کے نام سے سامنے آیا، جس کی صورت یہ تھی کہ تاجر کشتی کے مالک کو بحری سفر پر آمادہ کرنے کے لیے اتنا قرض دیتا جو کشتی اور اس پر موجود سامان کی قیمت کے برابر ہوتا۔ اگر کشتی بندرگاہ پر باحفاظت پہنچنے میں کامیاب ہو جاتی تو کشتی کا مالک وہ رقم اضافے کے ساتھ واپس کرتا لیکن اگر سمندر میں غرق ہو جاتی تو تاجر کا قرض رائیگاں ہو جاتا۔

✽ بحری انشورنس کی پہلی باقاعدہ دستاویز ۱۲۳۱ اکتوبر ۱۳۲۷ء میں اٹلی میں لکھی گئی۔

✽ چودھویں صدی عیسوی کے آخر میں جب اٹلی اور بحر روم کے ساحلی ممالک کے درمیان تجارت کو فروغ ملا تو انشورنس میں بھی وسعت پیدا ہوئی۔

✽ بری انشورنس کی ابتدا سترھویں صدی عیسوی میں لندن سے ہوئی۔ جس کا پس منظر

یہ ہے کہ ۱۶۶۶ء میں لندن میں ایک خوف ناک آگ بھڑک اٹھی، جس سے تیرہ

ہزار سے زائد مکانات، سو کے قریب گرجا گھر، بہت سی دکانیں اور فیکٹریاں جل کر

راکھ ہو گئیں۔ مستقبل میں ناگہانی نقصانات سے بچنے کی سوچ نے لوگوں کو

انشورنس کی راہ دکھائی، وہ یہودی ساہوکار جو اٹلی سے نکلنے کے بعد لندن کو اپنا مرکز

بنائے ہوئے تھے انہوں نے اس واقعے کو غنیمت جانا اور لوگوں کو آتشزدگی سے بچنے

والے نقصان کا ازالہ کرنے کے لیے انشورنس کی ترغیبات دینا شروع کیں اس

طرح اس کی متعدد صورتیں سامنے آئیں۔



✽ اٹھارویں صدی عیسوی میں انشورنس کا کاروبار پورے یورپ اور امریکی ریاستوں میں پھیل چکا تھا۔

✽ انیسویں صدی صنعتی ترقی کا دور ہے، اس میں انشورنس کی ایک نئی قسم ”تھرڈ پارٹی انشورنس“ (تامین ضد المسئولية) سامنے آئی۔

✽ اس کے بعد Mutual (التأمين التبادلي) اور گڈز انشورنس متعارف ہوئیں۔

✽ انیسویں صدی کا آخر لائف انشورنس (تامین الحیاة) کے متعارف ہونے کا زمانہ ہے۔

✽ اسلامی ممالک انیسویں صدی میں یورپی تاجروں کے توسط سے اس سے آشنا ہوئے، شام کے فقیہ علامہ ابن عابدین شامی پہلے عالم ہیں جنہوں نے ”سوکرہ“ کے نام سے اس کا ذکر کیا۔

✽ بعض مفکرین اس کا ابتدائی دور ۹۱۶ ق م بیان کرتے ہیں، جب روڈس (جزیرہ یونان) میں بحری تاجروں کے نقصان کی تقسیم کا نظام وضع کیا گیا۔

✽ بعض مفکرین کی رائے میں اس فکر کا بانی رومن ایمپائر ہے، جس نے اپنی بحری فوجی قوت کو مضبوط کرنے کے لیے اسلحے کے تاجروں سے یہ وعدہ کیا کہ نقصان کی صورت میں حکومت تلافی کرے گی لیکن یہ درست نہیں، کیونکہ اس صورت میں تاجر سے کچھ وصول نہیں کیا جاتا، حکومت کی طرف سے جو کچھ دیا جاتا تھا وہ ایک طرفہ ہوتا تھا۔ انشورنس میں یہ بات نہیں ہوتی۔ اس لیے اسے انشورنس کی بجائے ضمان کہنا چاہیے۔

انشورنس کا مفہوم:

انشورنس انگریزی زبان کے لفظ Insure سے ہے جو وثوق دلانے اور ضمانت کے معنی میں آتا ہے۔ انشورنس کا اطلاق ایسے معاملے پر ہوتا ہے جس میں کوئی شخص یا ادارہ

دوسرے شخص کو یہ ضمانت دیتا ہے کہ مستقبل میں پیش آنے والے فلاں ممکنہ خطرات کے نقصان کی تلافی وہ کرے گا۔ چنانچہ اس شرط پر دوسرا شخص ایک معینہ مدت تک ایک مقرر رقم اقساط کی صورت میں ادا کرتا ہے۔ عربی میں انشورنس کے لیے ”تائین“ کا لفظ استعمال ہوتا ہے جو ”امن“ سے ماخوذ ہے جس کا معنی طمانیت قلب اور خطرے سے محفوظ رہنا ہے، انشورنس کے ذریعے بھی انسان مستقبل کے خطرات سے محفوظ رہتا ہے، اس لیے اسے تائین کہتے ہیں۔

انشورنس کی قسمیں:

منتظم اداروں کے لحاظ سے اس کی تین قسمیں ہیں۔

(۱) گروپ انشورنس:

حکومت ملازمین کی فلاح و بہبود کے لیے ایک پالیسی ترتیب دیتی ہے جس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ ملازمین کی تنخواہ سے قانوناً کچھ رقم ہر ماہ ادائیگی سے قبل ہی وضع کر لی جاتی ہے جو ایک فنڈ میں جمع ہوتی رہتی ہے۔ ملازم کی ریٹائرمنٹ، انتقال یا حادثے کی صورت میں خود ملازم یا اس کے ورثاء کو اضافی رقم کے ساتھ واپس کر دی جاتی ہے پھر آگے اس کی مختلف صورتیں ہیں۔ انشورنس کی یہ صورت غیر اختیاری ہے جس سے قانونی مجبوری کی وجہ سے بچنا انسان کے اختیار میں نہیں ہے اس لیے اس پر اتفاق ہے کہ اس قسم کی انشورنس کرانے کی صورت میں انسان عند اللہ بری ہوگا البتہ اضافی رقم کے متعلق دو نقطہ نظر ہیں۔

✽ اکثر علماء کے خیال میں اس سے حکومت کا مقصد نفع کمانا نہیں بلکہ ملازمین سے تعاون ہوتا ہے اور حکومت کی ذمہ داری بھی ہے کہ وہ ملازمین کی ضروریات کا خیال رکھے، اس لیے اضافی رقم وصول کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

✽ دوسری رائے یہ ہے کہ اضافی رقم ذاتی استعمال میں نہ لائی جائے بلکہ غرباء اور مساکین پر خرچ کر دی جائے۔

### (۲) میوچل انشورنس:

اس کا انتظام امداد باہمی کی تنظیمیں کرتی ہیں۔ اس کا مقصد نقصان کی صورت میں ایک دوسرے سے تعاون کرنا ہے نہ کہ تجارت اور دوسروں کے مال سے حصول نفع۔ اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ کسی ادارے، جماعت یا قبیلے کے لوگ باہم مل کر ایک فنڈ تشکیل دیتے ہیں اور کسی رکن کو حادثہ پیش آنے کی صورت میں اس فنڈ سے اس کی مدد کی جاتی ہے۔ اگر فنڈ میں جمع شدہ رقم کم پڑ جائے تو اراکین سے مزید وصول کی جاتی ہے اور اگر بچ جائے تو آئندہ سال کے لیے جمع کر لی جاتی ہے۔ اس کی بنیاد سراسر تعاون پر ہے جس میں کوئی شرعی قباحت نہیں پائی جاتی۔ اس لیے انشورنس کی یہ قسم جائز اور مباح ہے۔

### (۳) کمرشل انشورنس:

انشورنس کی اس قسم کا انتظام کاروباری کمپنیاں کرتی ہیں جن کے پیش نظر لوگوں سے مالی تعاون کی بجائے مال کمانا ہوتا ہے۔ اس کا طریقہ کار یہ ہوتا ہے کہ بیمہ ہولڈر کمپنی کو ایک متعین رقم اقساط کی صورت میں مخصوص مدت تک ادا کرتا ہے اس کے عوض بیمہ کمپنی اسے یہ یقین دہانی کرواتا ہے کہ کمپنی اس کے فلاں نوعیت کے نقصان کی تلافی کرے گی، انشورنس کی یہ قسم بطور کاروبار اختیار کی جاتی ہے، اس لیے اسے کمرشل انشورنس کہا جاتا ہے۔

جب انشورنس کا لفظ بغیر کسی اضافی قید کے ذکر کیا جائے تو اس سے یہی قسم مراد ہوتی ہے اور محل نزاع بھی یہی ہے۔ اس کی مزید بے شمار قسمیں ہیں اگر ان سب کو مختصر بیان کیا جائے تو بنیادی طور پر ان کی تین قسمیں بنتی ہیں۔

### لائف انشورنس:

انشورنس کمپنی کسی شخص سے یہ معاہدہ کرتی ہے کہ وہ ایک مقرر رقم اقساط کی صورت میں کمپنی کو ادا کرے گا۔ اگر معینہ مدت میں اس شخص کا طبعی یا حادثے میں انتقال ہو گیا تو کمپنی طے شدہ رقم اس کے ورثاء کو ادا کرے گی۔ اگر وہ شخص معینہ مدت تک زندہ رہے تو

ادا شدہ رقم مع اضافہ کے ساتھ واپس مل جاتی ہے۔ اس کی بعض صورتوں میں مدت کا تعین ہوتا ہے اور بعض میں نہیں۔

گڈز انشورنس:

انشورنس کی اس قسم کا مقصد ممکنہ نقصان کے ازالہ کی ضمانت حاصل کرنا ہوتا ہے جس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ ایک شخص معینہ مدت کے لیے مقررہ رقم قسطوں میں کمپنی کو ادا کرتا ہے انشورنس کمپنی اس کو یقین دلاتی ہے کہ اگر حادثے کی وجہ سے انشورنس کروائی گئی چیز کا نقصان ہو گیا تو اس کی تلافی وہ کرے گی بصورت دیگر ادا شدہ رقم واپس نہیں ہوگی۔

انشورنس کی ان دو قسموں میں بنیادی فرق یہ ہے کہ پہلی میں معینہ مدت میں وفات نہ ہونے پر ادا شدہ رقم اضافے کے ساتھ مل جاتی تھی دوسری صورت میں رقم واپس نہیں ہوتی۔

تھرڈ پارٹی انشورنس:

انسان اپنی غلطی، غفلت یا سستی کی وجہ سے دوسرے شخص کو پہنچنے والے نقصان کی ذمہ داری سے بچنے کے لیے جو انشورنس کرواتا ہے اسے تھرڈ پارٹی انشورنس کہتے ہیں۔ مثلاً اس غرض سے گاڑی انشورنس کروانا کہ گاڑی سے نقصان کی صورت میں مالک کی بجائے انشورنس کمپنی اس کا ازالہ کرے۔

کمرشل انشورنس کا شرعی حکم:

درج ذیل خرابیوں کی بنا پر کمرشل انشورنس کی تمام شکلیں ممنوع ہیں۔

✽ ان میں ربا کی دونوں قسمیں ربا النسیئة اور ربا الفضل پائی جاتی ہیں کیونکہ انشورنس ہولڈر نے کمپنی کو متعین رقم اس شرط پر ادا کرنا ہوتی ہے کہ حادثے کی صورت میں کمپنی اس کو طے شدہ رقم ادا کرے گی، وہ رقم یا تو اس کی ادا کی ہوئی رقم سے زیادہ ہوگی یا کم۔ اگر زیادہ ہوگی تو اس میں ربا النسیئة اور ربا الفضل دونوں کی آمیزش ہوگی اور یہ دونوں حرام ہیں، کم ہونے کی صورت میں ربا النسیئة کا معاملہ

قرار پائے گا۔

✽ یہ غرر پر مشتمل ہے کیونکہ اس میں ادائیگی ایک ایسے واقعہ پر موقوف ہوتی ہے۔ جس میں دونوں احتمال پائے جاتے ہیں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بیمہ ہولڈر نے ابھی کچھ قسطیں ہی ادا کی ہوں اور واقعہ پیش آجائے اس پر کمپنی کے ذمہ مکمل ادائیگی آجائے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ وہ واقعہ پیش نہ آئے اور اس کی تمام اقساط بغیر معاوضے کے کمپنی کے کھاتے میں چلی جائیں۔

✽ شرعی طور پر کسی پر ضمان لازم ہونے کی ایک ہی صورت ہے نقصان براہ راست اس نے کیا ہو یا کم از کم اس نقصان کا سبب بنا ہو، یہاں نہ تو انشورنس کمپنی نے نقصان کیا ہوتا ہے اور نہ ہی وہ اس کا سبب ہوتی ہے۔ لہذا اس پر ضمان لازم کرنا شرعاً جائز نہیں، اس کو ”عقد موالات“ پر قیاس کرنا ”قیاس مع الفارق“ ہے۔

✽ ایک تو اس لیے کہ عقد موالات میں بنیادی شرط یہ ہے کہ عاقد کا کوئی وارث زندہ نہ ہو، اگر کوئی وارث ہو تو یہ باطل قرار پاتا ہے۔

✽ دوسرا اس لیے کہ انشورنس کا مقصد مادی فائدہ کا حصول ہے جس میں ربا اور غرر کی آمیزش ہے۔ جب کہ عقد موالات میں ہر طرح کے حالات میں تعاون مقصود ہوتا ہے۔

✽ تیسرا اس لیے کہ فقہاء کے ایک طبقہ کی رائے میں عقد موالات کا حکم اب باقی نہیں رہا بلکہ منسوخ ہو چکا ہے۔

لیزنگ:

مروجہ جدید مالی معاملات میں سے ایک لیزنگ بھی ہے لیز اصل میں عربی کے لفظ الاجارۃ کا ترجمہ ہے جو شرعی اصطلاح ہے لیکن مروجہ لیزنگ شرعی اجارہ سے مختلف ہے۔ شرعی اجارہ کا مفہوم تو صرف اتنا ہے۔

((بيع منفعة معلومة باجر معلوم)) [عمدة القاری شرح صحیح بخاری:

ج ۱۸، ص ۲۵۱]

”طے شدہ اجرت کے بدلے طے شدہ منفعت (حق استعمال) فروخت کرنا۔“

اس کی دو قسمیں ہیں:

- ۱۔ معاوضے کے بدلے کسی شخص (انجینئر وغیرہ) کی خدمات حاصل کرنا۔
- ۲۔ اپنی ذاتی چیز جیسے گاڑی یا مکان کا حق استعمال کسی دوسرے کی طرف منتقل کرنا اور اس کے عوض کرایہ وصول کرنا۔

جب لیزنگ کا لفظ بولا جاتا ہے تو اقتصادی ماہرین کے نزدیک اس سے عموماً اجارہ کی یہ آخری قسم ہی مراد ہوتی ہے۔

صحیح بخاری میں اجارہ کے عنوان کے تحت دونوں قسموں کا بیان ہے اجارہ کی اس قسم میں چونکہ چیز اصل مالک کی ملکیت ہی ہوتی ہے کرایہ دار صرف اس سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ لہذا ملکیتی اخراجات کرایہ دار کے ذمے ہوں گے۔ مثلاً مکان کرائے پر دیا گیا ہے تو اس کا پراپرٹی ٹیکس مالک ادا کرے گا لیکن بجلی، گیس اور پانی کا بل کرایہ دار کے ذمہ ہوگا۔ اسی طرح اگر کرایہ پر دی گئی چیز کا ایسا نقصان ہو جائے جس میں کرایہ دار کی غلطی، غفلت یا کوتاہی کا عمل دخل نہ ہو تو وہ نقصان بھی مالک ہی برداشت کرے گا۔

لیزنگ کا جدید مفہوم:

اس کے برعکس انیسویں صدی عیسوی سے لیزنگ کی ایک نئی قسم متعارف ہوئی جس کو عربی میں ”البيع الايجاری“ یعنی وہ اجارہ داری جس کی انتہا بیع پر ہوتی ہے (ہائر پر چیز) اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ بینک کسی کو کچھ سالوں کے لیے گاڑی خرید کر لیز پر دیتا ہے اس کا کرایہ اقساط میں وصول کیا جاتا ہے۔ بینک کرایہ طے کرتے وقت اس بات کا خاص خیال رکھتا ہے کہ اس عرصے میں گاڑی کی قیمت مع اتنے نفع کے جو اس عرصے میں بینک کو اس رقم پر سود کی شکل میں حاصل ہونا تھا وصول ہو جاتے ہیں جب گاڑی مکمل

اقساط ادا کر دیتا ہے تو گاڑی اس کی ملکیت ہو جاتی ہے اس طرح ابتدا میں یہ اجارہ ہوتا ہے جو آخر میں بیچ میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اس عرصے میں گاڑی کے ہر طرح کے نقصانات کی ذمہ داری گاہک کی ہوتی ہے بعض اہل علم کی رائے میں یہ ایک جدید صورت ہے۔ دین میں اس کے متعلق کوئی ممانعت نہیں ہے اس لیے جائز ہے۔ جب کہ بعض حضرات کے نزدیک یہ ایک عقد (Contract) میں دو عقد جمع ہونے کی وجہ سے ناجائز ہے۔

ہمارے خیال میں اس میں زیادہ قابل اعتراض پہلو سود کی آمیزش کا ہے۔ اس کی تفصیل یوں ہے کہ گاہک جب بینک کے پاس گاڑی لینے جاتا ہے تو وہ اس کی قیمت کا کچھ حصہ ڈاؤن پے منٹ (Down Payment) کے نام سے پہلے ادا کرتا ہے جو زیادہ بھی ہو سکتا ہے اور کم بھی لیکن ایک خاص شرح (گاڑی کی قیمت کا دس فیصد) سے کم نہیں ہوتا اب بینک نے کرائے کے نام پر جو اضافی رقم وصول کرنا ہوتی ہے اس کا انحصار اس پر ہوتا ہے کہ ڈاؤن پے منٹ کی رقم کتنی ہے؟ اگر وہ زیادہ ہے تو اضافی رقم زیادہ وصول کی جائے گی۔ اس بارے میں ہم نے مسلم کمرشل بینک کے ایک ذمہ دار سے جو معلومات حاصل کی ہیں ان کے مطابق اگر آپ بینک سے Baleno گاڑی لیتے ہیں اور ڈاؤن پے منٹ پانچ لاکھ ادا کرتے ہیں تو آپ کو پانچ سال کے لیے ۹۷۳۸ روپے ماہانہ قسط جمع کروانا ہوگی جو ۵۸۲۲۸۰ روپے بنتے ہیں۔ اس میں پانچ لاکھ ڈاؤن پے منٹ جمع کر لیں تو مکمل ۱۰۸۲۲۶۰ روپے بنیں گے۔ اگر آپ ڈاؤن پے منٹ دو لاکھ کرتے ہیں تو آپ پانچ سال تک ۱۶۴۰۸ روپے کی ماہانہ قسط جمع کروائیں گے جو ۹۸۲۲۸۰ روپے بنتے ہیں۔ دو لاکھ ڈاؤن پے منٹ کے نام سے پہلے ادا کیا جا چکا ہے اس طرح کل رقم: ۱۱۸۲۲۸۰ روپے ہوگی۔ پہلی صورت میں ایک لاکھ دو سو روپے کم اور دوسری صورت میں زیادہ کیوں؟ سیدھی سی بات ہے کہ یہ سودی معاملہ ہے پہلی صورت میں بینک کو چونکہ کم پیسے دینے پڑے اس لیے اس کا سود کم اور دوسری صورت میں زیادہ رقم دینا پڑی اس لیے سود بھی زیادہ بنا۔ اگر یہ حقیقی اجارہ ہوتا تو یہ فرق نہ ہوتا!! کیونکہ اجارہ



میں کرائے کا تعلق حق استعمال سے ہوتا ہے جو دونوں صورتوں میں برابر ہے نہ کہ اس بات سے کہ اس میں بینک کے کتنے پیسے استعمال ہوتے ہیں نیز اگر یہ حقیقی اجارہ ہوتا تو بینک اس کے نقصان کا بھی ذمہ دار ہوتا، اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اصل میں یہ سودی معاملہ ہے جسے اجارہ کا نام دیا گیا ہے۔ حقیقی اجارہ سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

ایک شبہ کا ازالہ:

بظاہر یہ بیع قسط کے مشابہ ہے اس لیے بعض حضرات اسے بیع قسط قرار دے کر اس کا جواز ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن درج ذیل وجوہ کے باعث یہ درست نہیں:

✽ سطور بالا میں ہم نے اس کی جو تفصیل بیان کی ہے اس کے مطابق اسے بیع قسط قرار دینے کی قطعاً گنجائش نہیں۔

✽ یہ دراصل دو عقدوں (Contracts) پر مشتمل ہے:

(1) عقد اجارہ۔ (ب) عقد بیع۔

جب کہ بیع قسط میں صرف ایک عقد ہوتا ہے بیع اور اجارہ دو الگ الگ اصطلاحات ہیں اور ہر ایک کے احکام بھی مختلف ہیں۔

✽ بیع قسط میں قیمت تو ادھار ہوتی ہے مگر ملکیت فوراً خریدار کے نام منتقل ہو جاتی ہے۔ لیکن یہاں ملکیت تمام اقساط کی ادائیگی پر موقوف ہے یہ عقد بیع کے منافی ہے کیونکہ بیع کا اصل مقصد ہی یہ ہے کہ چیز مکمل طور پر فروخت کنندہ کی ملکیت سے نکل کر خریدار کی ملکیت میں آجائے۔

لیزنگ کا متبادل:

اسلامی فقہ اکیڈمی جدہ نے اپنے اجلاس جو ۱۰ تا ۱۵ دسمبر ۱۹۸۸ء کو کویت میں منعقد

ہوا اس میں مروجہ لیزنگ کے درج ذیل دو متبادل تجویز کیے تھے۔

مدت ختم ہونے کے بعد مستاجر (Lessee) کے پاس تین اختیار ہوں۔

۱۔ گاڑی مالک (بنک) کے حوالے کر کے عقد اجارہ ختم کر دے۔

۲۔ نئے سرے سے عقد اجارہ کر لے۔

۳۔ گاڑی خرید لے۔

[بحوالہ: بحوث فی الاقتصاد الاسلامی للدكتور علی القراءه الداغی]  
 اگرچہ اس پر بھی بعض علماء کے تحفظات ہیں مثلاً مدت اجارہ پوری ہونے پر کرایہ پر لینے والا تو آزاد ہے مگر موجر (Lessor) اس کی پسند کا پابند ہے لیکن یہ اعتراض کوئی زیادہ وزنی نہیں اس لیے یہ صورت شرعی طور پر جائز ہے۔ بشرطیکہ اس کی عملی تطبیق میں کوئی گڑبڑ نہ ہو۔

مروجہ لیزنگ کا دوسرا متبادل:

اسلامی فقہ اکیڈمی نے اس کی جگہ دوسرا متبادل بیع قسط تجویز کیا ہے لیکن اس شرط کے ساتھ کہ اس میں انتقال ملکیت آخری قسط کی ادائیگی پر موقوف نہ ہو بلکہ دوسری ضمانتیں ہوں۔ [حوالہ مذکورہ]

شیرز (حصص) کی خرید و فروخت:

دورِ حاضر کے مالی معاملات میں سے ایک شیرز کی تجارت کا مسئلہ بھی ہے۔ جو فی زمانہ تجارت کی سب سے زیادہ مقبول صورت ہے حتیٰ کہ کسی ملک کی اقتصادی ترقی اور تجارتی گہما گہمی کا تعین بھی سٹاک ایکسچینج کے اتار چڑھاؤ سے کیا جاتا ہے، گویا سرمایہ کاری کا رخ بتانے میں اس کی حیثیت بیرومیٹر کی ہے۔

شیرز کی تاریخ:

چند افراد کا باہم مل کر شراکت کے اصولوں کے مطابق کاروبار کرنا زمانہ قدیم سے رائج ہے۔ عصر حاضر میں اس کو پارٹنرشپ کہا جاتا ہے۔ سترھویں صدی عیسوی میں

مشارکت سے ملتی جلتی کاروبار کی ایک نئی شکل سامنے آئی جس کو جوائنٹ سٹاک کمپنی کہا جاتا ہے۔ مشترکہ کاروبار کا یہ ایک نیا تصور تھا جس سے پہلے لوگ شناسا نہیں تھے اس لیے کتب فقہ میں اس کا ذکر بھی نہیں ملتا۔ اس سے پہلے شخصی کاروبار ہوتا تھا یا پھر شراکت و مضاربت کی بنیاد پر۔ جس جگہ کمپنیوں کے شیئرز کا لین دین ہوتا ہے اس کو سٹاک مارکیٹ کہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ دنیا کی پہلی سٹاک ایکسچینج ایسٹریڈیم ہالینڈ میں ۱۶۱۱ء میں قائم ہوئی۔ برصغیر میں پہلی سٹاک ایکسچینج اٹھارویں صدی کے آخری نصف میں بمبئی میں قائم ہوئی تھی۔ اس کاروبار میں غیر معمولی وسعت اس وقت پیدا ہوئی جب بیسویں صدی کے آخری نصف میں تجارتی میدان میں اصلاحات کا عمل شروع ہوا اور اس کے نتیجے میں نئی نئی کمپنیاں قائم ہونے لگیں۔ درمیان میں کچھ عرصہ کے لیے اس پر جمود بھی طاری رہا بالخصوص ان ممالک میں جہاں صنعتوں کو قومیا نے (Nationalized) کا رجحان غالب تھا۔

### شیئرز کی حقیقت:

شیئرز کے لیے اُردو میں حصص اور عربی میں اَسْهُم کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے۔ شیئرز کس چیز کی نمائندگی کرتا ہے اس سلسلے میں علماء کی مختلف آراء ہیں ایک گروہ کے خیال میں حصص دراصل کمپنی میں شیئرز ہولڈرز کے متناسب حصہ کی نمائندگی کا نام ہے اس کی توضیح یوں ہے کہ کمپنی کا کل منظور شدہ سرمایہ مساوی اجزاء میں عام طور پر دس دس روپے میں تقسیم کر دیا جاتا ہے ہر جزء کو حصہ کہا جاتا ہے۔ جو لوگ حصص خریدتے ہیں وہ اس متناسب سے کمپنی کے حصہ دار ہوتے ہیں اگر کوئی شیئرز ہولڈر اپنا حصہ فروخت کرنا چاہے تو وہ سٹاک مارکیٹ میں فروخت بھی کر سکتا ہے۔

دوسرے گروہ کی رائے میں شیئرز محض کمپنی کو دیے ہوئے قرض کا دستاویزی ثبوت ہیں۔ ان حضرات کا استدلال اس بات سے ہے کہ اگر شیئرز ہولڈر دیوالیہ ہو جائے

تو کمپنی میں اس کے متناسب حصے کی ضبطی نہیں ہوتی جس کی نمائندگی یہ شیئرز کر رہے ہوتے ہیں۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ شیئرز ہولڈر کمپنی کا حصہ دار نہیں ہوتا بلکہ اس نے کمپنی کو قرض دیا ہوتا ہے۔ لیکن دو وجہ سے یہ استدلال درست نہیں۔

❁ دیوالیہ ہونے کی صورت میں کمپنی میں اس کے حصے کی قرقی نہ ہونے کے وجہ یہ نہیں کہ کمپنی میں اس کی ملکیت نہیں بلکہ اس کا سبب یہ ہے کہ کمپنی کا اصول ہے کہ کوئی شخص حصہ دار بننے کے بعد کمپنی کی تحلیل سے قبل اپنا حصہ نہیں نکلا سکتا، ہاں! ضرورت کے وقت سٹاک مارکیٹ میں فروخت کر سکتا ہے۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ کمپنی میں اس کی ملکیت نہیں تھی۔ جس طرح بعض فقہاء کے نزدیک دیوالیہ ہونے کی صورت میں مکان قرق نہیں ہوتا۔ اس کا یہ معنی تو نہیں کہ وہ مکان کا مالک بھی نہیں تھا۔

❁ اگر کمپنی تحلیل ہو جائے تو اس کے اثاثوں کی تقسیم سے ہر شیئرز ہولڈر کو اس کے حصے کے متناسب سے حصہ ملے گا جس کی مالیت اس کی لگائی ہوئی رقم سے زیادہ بھی ہو سکتی ہے اور کم بھی۔ اگر ملکیت نہ ہوتی تو حصہ ملنے کا کیا معنی؟

شرعی حکم:

جن حضرات کی رائے میں شیئرز کمپنی کو دیئے گئے قرض کی نمائندگی کرتا ہے ان کے نزدیک شیئرز کا کاروبار حرام ہے بعض علماء تو شیئرز کے لین دین کو قمار اور سٹہ بازی بھی قرار دیتے ہیں لیکن گزشتہ سطور میں ہم نے شیئرز کی حقیقت کے متعلق جو تفصیل بیان کی ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ شیئرز کی فروخت درحقیقت کمپنی میں شیئرز ہولڈر کے متناسب حصے کی فروخت ہے۔ جس کی کمی بیشی کے ساتھ خرید و فروخت میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ خواہ ڈیویڈنڈ حاصل کرنے کی نیت ہو یا قیمت بڑھنے کی صورت میں آگے فروخت کرنا مقصود ہو۔

یہاں یہ بات بھی ملحوظ خاطر رہے کہ یہ جواز تین پابندیوں کے ساتھ مشروط ہے۔  
۱۔ جس کمپنی کے شیئرز خریدے جا رہے ہیں اس کا کاروبار حلال ہو سو وہ میں ملوث نہ ہو۔

۲۔ کمپنی کے اثاثہ جات صرف نقد اور قرضوں کی شکل میں ہی نہ ہوں بلکہ جامد اور مال کی شکل میں بھی ہوں۔

۳۔ فروخت اپنی سادہ شکل میں ہو کہ خریدار رقم دے اور فروخت کنندہ حصص اس کے نام منتقل کر دے اگر حصص کے کاروبار کی کسی قسم کا شرعی اصول سے ٹکراؤ ہو تو وہ صورت بلاشبہ ناجائز ہوگی۔

سعودی عرب کے سابق مفتی اعظم شیخ عبدالعزیز بن باز رحمۃ اللہ علیہ کی سربراہی میں قائم مستقل فتویٰ کمیٹی نے بھی بعض شرطوں کے ساتھ اس کو جائز قرار دیا ہے۔ چنانچہ ”فتاویٰ اللجنة الدائمة“ میں ہے:

(( اذا كانت الاسهم لا تمثل نقودا تمثيلا كلياً او غالباً ، وانما تمثل ارضاً او سيارات او عمارات ونحو ذلك ، وهى معلومة للبائع والمشتري ، جاز بيعها وشراؤها بضمن حال او مؤجل على دفعة او دفعات لعموم أدلة جواز البيع والشراء ))

[فتاویٰ اللجنة الدائمة: ج ۱۳، ص ۳۲۱]

”جب شیئرز کلیتاً یا غالب طور پر نقدی کی نمائندگی نہ کر رہے ہوں بلکہ زمین یا گاڑیوں یا عمارات اور اس قسم کی دوسری چیزوں کی نمائندگی کر رہے ہوں اور بائع اور مشتری کو معلوم بھی ہو تو خرید و فروخت کے عمومی دلائل کی بنا پر نقد یا ادھار قیمت پر ان کی خرید و فروخت جائز ہے۔ ادھار کی صورت میں خواہ قیمت ایک ہی قسط میں ادا کی جانی ہو یا متعدد اقساط میں۔“

شیئرز کی خرید و فروخت کی بعض ناجائز صورتیں:

ذیل میں حصص کی خرید و فروخت کی ہم دو ایسی صورتیں بیان کرتے ہیں جن پر شاک

ایک بیچ میں بکثرت عمل ہو رہا ہے مگر وہ شرعی اصول کی مخالفت کی وجہ سے ناجائز ہیں۔

فیوچر سیل:

ایک شخص دوسرے سے یہ معاہدہ کرتا ہے کہ وہ اتنی مقدار یا تعداد میں فلاں چیز مستقبل کی فلاں تاریخ کو اس قیمت پر جو اس وقت واجب الادا ہوگی اس کو ادا کرے گا یا اس وقت اس کی قیمت کی خرید و فروخت میں جو فرق ہوگا وہ ایڈجسٹ کرے گا یہ صورت ناجائز ہے۔ ایک تو اس لیے کہ اس میں حصص اور قیمت دونوں ادھار ہیں فروخت کنندہ نے حصص بعد میں دینے ہیں اور خریدار نے قیمت بعد میں ادا کرنی ہے۔

دوسرا اس لیے کہ اس میں چیز کو قبضہ میں لینے سے پہلے فروخت کر دیا جاتا ہے جو کہ شرعاً منع ہے۔ بعض حضرات اسے بیع سلم سے قیاس کرتے ہیں جو درست نہیں اس کی تین وجوہ ہیں:

\* شیئرز میں بیع سلم نہیں ہو سکتی کیونکہ متعین باغ یا کھیت کی پیداوار میں سلم جائز نہیں جبکہ شیئرز میں کمپنی کا نام ذکر کرنا ضروری ہوتا ہے اس سے اس کی حیثیت متعین چیز میں بیع سلم کی ہو جاتی ہے جو ناجائز ہے۔

\* بیع سلم میں چیز کی مکمل قیمت پہلے ادا کرنا ضروری ہے جو یہاں نہیں۔

\* بیع سلم میں چیز قبضہ سے قبل فروخت کرنی منع ہے۔ لیکن فیوچر سیل میں حوالگی کی تاریخ سے قبل کئی سودے ہو چکے ہوتے ہیں۔

پیشگی فروخت میں اگر صرف فرق برابر کرنا مقصود ہو تو یہ سٹہ بازی ہوگی جو حرام ہے۔

شارٹ سیل:

بعض دفعہ فروخت کنندہ ایسے شیئرز بھی بیچ دیتا ہے جو اس کے پاس موجود تو نہیں ہوتے لیکن اسے یہ امید ہوتی ہے کہ وہ کلیئرنگ سے قبل مارکیٹ سے سستے داموں حاصل کر کے خریدار کے حوالے کر دے گا اس کو شارٹ سیل کہا جاتا ہے یہ جائز نہیں ہے کیونکہ

جو چیز انسان کی ملکیت میں نہ ہو اس کو بیچنا درست نہیں۔  
بدلہ:

دو ایک دوسرے کے ساتھ مربوط سودے جو بیک وقت ہوتے ہیں ایک فریق اپنی موجودہ حیثیت (Position) یعنی وہ خریدے ہوئے حصص جو ابھی فروخت نہیں کیے گئے حالیہ ادائیگی سے اگلی ادائیگی میں منتقل کر رہا ہوتا ہے اور اس کے لیے وہ کچھ اضافی رقم ادا کرتا ہے۔ اسے عام زبان میں بدلہ کہا جاتا ہے۔ جس کا معنی ہے ادائیگی کا دن بدل جانا۔ اس کو سادہ الفاظ میں اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے کہ ایک آدمی نے حصص تو خرید لیے لیکن اس کے پاس ادائیگی کے لیے رقم نہیں وہ یہ چاہتا ہے کہ میری یہ حیثیت آئندہ ادائیگی میں منتقل ہو جائے دوسرا آدمی اس شرط پر وہ حصص خرید لیتا ہے کہ اس نے اگلی ادائیگی میں اضافی رقم لے کر واپس کرنے ہوتے ہیں۔ یہ جائز نہیں کیونکہ یہ سودا واپسی مع اضافہ کے ساتھ مشروط ہے جو جائز نہیں۔





## کاروباری دستاویزات

یہ امر واقع ہے کہ نقد یا کرنسی خواہ کتنی ہی مضبوط قوت خرید کی حامل کیوں نہ ہو تجارتی ضروریات کے مقابلہ میں ناکافی ہوتی ہے۔ چنانچہ تجارتی حلقوں نے اس کمی کو پورا کرنے کے لیے ایسی دستاویزات متعارف کروائیں ہیں جو کاروباری طبقہ میں نقد کی طرح ہی معتبر سمجھی جاتی ہیں۔ ان کو بینکاری کی اصطلاح میں ”آلات اعتبار“ انگریزی میں Instruments of credit اور عربی میں ”الاوراق التجارية“ کہا جاتا ہے۔ یہ دستاویزات یا آلات اگرچہ اب تجارتی سرگرمیوں کے علاوہ بھی استعمال ہوتی ہیں لیکن اصل میں ان کا اجراء کاروباری حضرات نے اپنی سہولت کی خاطر کیا تھا اس لیے ان کو ”الاوراق التجارية“ (کمرشل پیپرز) کا نام دیا جاتا ہے۔

کاروباری دستاویزات سے مراد:

جیسا کہ اوپر بیان ہوا کہ ان دستاویزات کے لیے آلات اعتبار کی اصطلاح وضع ہے ماہرین آلہ اعتبار کی تعریف یوں کرتے ہیں:

ایسی دستاویزات جو کاروباری لین دین میں زر کا نعم البدل ہوں اور مستقبل کی ادائیگی کے لیے استعمال ہوتی ہوں آلات اعتبار کہلاتی ہیں۔ جیسے چیک، ہنڈی اور تحریری وعدہ وغیرہ۔ [اصول بنکاری: ص ۳۳۸ از قاضی احتشام]

عربی میں ان کی تعریف یوں کی جاتی ہے:

((الاوراق التجارية صكوك ثابتة للتداول تمثل حقا نقديا و تستحق الدفع بمجرد الاطلاع او بعد اجل قصير ويجرى العرف على قبولها كاداة للوفاء)) [البنوك الاسلامية بين النظرية والتطبيق: ص ۱۳۴ للدكتور محمد بن عبد الله الطيار]

”کمرشل پیپرز سے باہمی لین دین کی وہ دستاویزی ثبوت مراد ہیں جو نقدی حق کی نمائندگی کرتے ہیں اور نوٹس موصول ہوتے ہی یا مختصر مدت بعد واجب الادا ہوتے ہیں عرف ان کو ایک آلہ ادائیگی کے طور پر قبول کرتا ہے۔“

چونکہ ان دستاویزات کے حقوق کسی دوسرے شخص کے نام بھی منتقل کیے جاسکتے ہیں اس لیے ماہرین اقتصادیات کی اصطلاح میں ان کو تحویل پذیر دستاویزات یا تحویل پذیر آلات اعتبار (Negotiable instruments) کہا جاتا ہے۔

ان کی تین بڑی قسمیں ہیں:

- ۱۔ ہنڈی: عربی میں ”الکمبالیة“ انگلش میں (Bill of exchange)۔
- ۲۔ پرامیسری نوٹ: عربی میں ”السند الاذنی“۔
- ۳۔ چیک۔

اور اق تجاریہ کی تاریخ ابتداء:

ان کی شروعات کے بارہ میں یقین سے کچھ کہنا مشکل ہے کیونکہ اس میں کافی اختلاف ہے۔ بعض محققین کی رائے میں ان کے موجد اہل یونان ہیں۔ بعض ان کا تعلق جمورابی کے دور سے جوڑتے ہیں بعض کے نزدیک یہ اہل چین جبکہ بعض دوسرے حضرات کے خیال میں اہل فارس کی ایجاد ہے۔ لیکن یہ سب آراء دلائل کی تائید سے محروم ہیں اس لیے حقیقت یہی ہے کہ ان کا ابتدائی دور متعین کرنا مشکل ہے تاہم اس اختلاف کے باوجود اکثر محققین کی رائے میں ایک بات یقینی ہے کہ ان کا استعمال بارہویں صدی عیسوی میں عام ہو گیا تھا۔ کیونکہ اس صدی کے آغاز میں نقدی کی نقل و حرکت کو محفوظ بنانے کے لیے ہنڈی ایک ذریعہ کے طور پر استعمال ہونا شروع ہو گئی تھی اور کچھ عرصہ بعد ادائیگی کے لیے اور ایک ہی شہر کے اندر بھی استعمال ہونا شروع ہو گئی۔

پرومیری نوٹ کا سترھویں صدی عیسوی میں ہوا۔ اسی صدی کے آخر ۱۴۹۴ء میں انگلینڈ

بینک کے قیام کے بعد چیک کا استعمال شروع ہوا۔ [احکام الاوراق التجارية فی

فقہ الاسلامی؛ ص: ۲۲، ۲۳ الدکتور سعد بن الترمذی]

کاروباری دستاویزات اور کاغذی کرنسی میں فرق:

اگرچہ تجارتی حلقوں میں یہ دستاویزات کرنسی کی طرح ہی معتبر سمجھی جاتی ہیں یہاں تک کہ بعض نے ان کو مجازی طور پر کرنسی بھی کہا ہے لیکن ان دونوں میں کئی اعتبار سے فرق ہے۔ مثلاً:

✽ قرض کی ادائیگی میں پیپر کرنسی کو قبول کرنا ضروری ہوتا ہے صاحب حق انکار نہیں کر سکتا جب کہ کمرشل پیپرز میں یہ پابندی نہیں ہوتی۔ اگر حق دار کمرشل پیپرز کو قبول کرنے سے انکار کر دے تو اس پر جبر نہیں کیا جاسکتا۔

✽ اگر صاحب حق ہنڈی میں درج رقم میعاد سے قبل وصول کرنا چاہے تو کٹوتی ہوتی ہے کرنسی میں یہ نہیں ہوتا۔

✽ کمرشل پیپرز میں مدت متعین ہوتی ہے جب کہ کرنسی غیر معینہ عرصہ کے لیے ہوتی ہے بشرطیکہ حکومت رائج کرنسی ختم کر کے نئی جاری نہ کر دے۔

✽ کاغذی کرنسی حکومت یا اس کی زیر نگرانی کوئی ادارہ ہی جاری کر سکتا ہے مگر کاروباری دستاویزات مختلف افراد اور ادارے بھی جاری کرتے ہیں۔

✽ کاروباری دستاویزات کے حقوق دوسرے کے نام منتقل کرتے وقت نظہیر (پشت پر دستخط) کی ضرورت ہوتی ہے۔ کرنسی اس کی محتاج نہیں ہوتی۔ (ملاحظہ ہو: ابحات

ھیئۃ کبار العلماء بالمملکۃ العربیۃ السعودیۃ: ۵/۳۲۵۔ احکام الاوراق

التجاریۃ فی الفقہ الاسلامی، ص: ۴۰، ۵۹ الدکتور سعد بن الترمذی)

کمرشل اور فنانشل پیپرز کا باہمی فرق:

فنانشل پیپرز کو عربی میں "الاوراق المالیه" کہتے ہیں ان سے مراد کمپنیوں کے

شیرز اور بانڈز (جو کمپنی حصول قرض کے لے جاری کرتی ہے) ہیں چنانچہ ڈاکٹر رفیق یونس مصری لکھتے ہیں:

((الاوراق المالية هي الاسهم والسندات)) [المصارف

الاسلامية: ص: ٤٨]

”اوراق مالیه (فنانشل پیپرز) سے مراد شیرز اور بانڈز ہیں۔“

ڈاکٹر احمد بن الخلیل کہتے ہیں اوراق مالیه کی دو قسمیں ہیں:

(۱) شیرز (۲) بانڈز

مزید لکھتے ہیں:

”کمرشل پیپرز فنانشل پیپرز سے مختلف ہیں اور دونوں کے حاملین کے حقوق بھی الگ

الگ ہیں کمرشل پیپرز کا مقصد مالی حقوق کی حفاظت اور دیون (Debt) ادا کرنا ہے

جب کہ فنانشل پیپرز کا مقصد منافع کا حصول اور کمپنی میں دوسرے حقوق حاصل کرنا

ہے۔“ [الاسهم والسندات واحكامها في الفقه الاسلامي: ص ٣٢، ٣٣]

ان دونوں کے باہمی فرق کو یوں بیان کیا جاسکتا ہے:

✽ کمرشل پیپرز عام طور پر دیون کی نمائندگی کرتے ہیں جو نوٹس موصول ہونے پر

یا مختصر مدت بعد واجب الادا ہوتے ہیں۔ جب کہ فنانشل پیپرز سرمایہ کاری قرض کی

رسید ہوتے ہیں۔

✽ فنانشل پیپرز کے حاملین کمپنی کے منافع میں حصہ دار ہوتے ہیں جب کہ کمرشل پیپرز

میں کوئی اضافی فائدہ نہیں ہوتا۔

✽ کمرشل پیپرز ہر وہ شخص جاری کر سکتا ہے جو ان کے اجراء کا اہل ہو لیکن فنانشل پیپرز

صرف مالیاتی ادارے اور کمپنیاں ہی جاری کرتی ہیں۔ اس کے علاوہ بھی کئی لحاظ

سے فرق ہے۔ تفصیل کے لے ملاحظہ ہوں: احکام الاوراق التجارية في الفقه

الاسلامی ص: ٦١، ٦٢ سعد بن الترمکی۔

کمرشل پیپرز کی مختلف قسمیں اور ان میں باہمی فرق:

پہلے بیان ہو چکا ہے کہ کمرشل پیپرز کی تین بڑی قسمیں ہنڈی، پرومزری نوٹ اور چیک ہیں۔ اب یہاں ہر ایک کا مفہوم اور ان کا باہمی فرق واضح کیا جاتا ہے۔

ہنڈی:

”ایک ایسی دستاویز ہے جس میں فروخت کرنے والا یا قرض خواہ خریدار یا مقروض کو حکم دیتا ہے کہ وہ ایک مخصوص رقم معینہ عرصہ بعد اسے یا جس کو وہ کہے ادا کر دے۔“

[اصول بینکاری، ص: ۲۲۵، ۲۲۶ از قاضی احتشام]

اس کی توضیح یوں ہے کہ ”الف“ ”ب“ کو مثلاً ایک لاکھ کا سامان بیچتا ہے۔ ”ب“ نقد ادائیگی کرنے کی بجائے ایک مہینہ کی مہلت مانگتا ہے اب ”الف“ مال روانہ کرنے کے ساتھ تحریر شدہ ہنڈی بھی ارسال کرے گا۔ ”ب“ ہنڈی پر قبول ہے کے الفاظ لکھ کر اور اپنے دستخط کر کے واپس ”الف“ کو بھیج دے گا۔ قبولیت اور دستخط کے بغیر ہنڈی کی کوئی قانونی حیثیت نہیں ہوتی۔ طے شدہ میعاد گزرنے پر ”الف“ ”ب“ کو ہنڈی پیش کر کے اپنی رقم وصول کر لے گا۔ عام طور پر فروخت کنندہ یہ کام خود کرنے کی بجائے بینک کی خدمات حاصل کرتا ہے۔ چنانچہ وہ ہنڈی بینک میں جمع کرواتا ہے بینک اس کی میعاد ختم ہونے سے کچھ دن پہلے خریدار کو نوٹس بھیجتا ہے۔ پھر طے شدہ مدت پوری ہونے پر رقم وصول کر کے فروخت کنندہ کے کھاتے میں جمع کر دیتا ہے۔ بینک اس خدمت کا معاوضہ لیتا ہے۔ اگر فروخت کنندہ کو رقم کی فوری ضرورت ہو تو وہ اس کی پشت پر دستخط کر کے اس کے حقوق بینک یا کسی تیسرے شخص کے نام بھی منتقل کر کے اس سے رقم وصول پاسکتا ہے بینک یا وہ شخص اس پر تحریر شدہ رقم میں ایک خاص شرح کے مطابق بالعموم مروجہ شرح سود کے مساوی کٹوتی بھی کرتا ہے۔ میعاد پوری ہونے پر بینک یا تیسرا شخص وہ رقم ہنڈی جاری کرنے والے سے وصول پالیتا ہے۔ اس کٹوتی کو بیٹہ لگانا کہا جاتا ہے (عربی

میں ”خصم الكمبيالة“ انگریزی میں (Discount bil of Exchange) پشت پر دستخط کرنے کو تظہیر (Endorsment) کہتے ہیں۔

پرامیسری نوٹ:

”جس میں مقروض اپنے قرض خواہ یا خریدار اپنے فروخت کار کو ایک مقررہ رقم عندالطلب یا ایک خاص عرصے بعد ادا کرنے کا وعدہ کرتا ہے۔“

[اصول بنکاری: ص ۲۴۱]

ہنڈی میں تین فریق ہوتے ہیں:

۱۔ مرتب کنندہ (الساحب Drawer):

اس سے مراد وہ شخص ہے جو ہنڈی لکھتا ہے اور اس نے دوسرے شخص سے قرض لینا ہوتا ہے۔

۲۔ مرتب الیہ (المسحوب علیہ Drawee):

اس سے مراد وہ شخص ہے جو مقروض ہوتا ہے اس کے نام ہنڈی تحریر کی جاتی ہے اور وہ ہنڈی پر دستخط کر کے اس کو قبول کرتا ہے۔

۳۔ وصول کنندہ (المستفید Payee):

یعنی وہ شخص ہنڈی کی رقم وصول پاتا ہے یہ مرتب کنندہ خود بھی ہو سکتا ہے یا وہ شخص جس کے پاس ہنڈی موجود ہو۔ [اصول بنکاری: ص ۲۲۵-۲۲۶]

پرامیسری نوٹ میں صرف دو فریق ہوتے ہیں:

۱۔ مرتب کنندہ: یہ وہ شخص ہوتا ہے جس نے قرض لیا یا ادھار مال خرید رکھا ہو۔

۲۔ وصول کنندہ: وہ شخص جس نے تحریری وعدہ کی رقم وصول کرنی ہو اور یہ عموماً قرض خواہ ہوتا ہے۔ [اصول بنکاری: ص ۲۴۱]

چیک:

”یہ کھاتہ دار کی طرف سے بینک کے نام ایک غیر مشروط حکم نامہ ہے جس میں وہ

بینک کو ہدایت دیتا ہے کہ وہ چیک پر درج شدہ رقم اس یا کسی مخصوص شخص یا حامل چیک کو ادا کرے دوسرے لفظوں میں چیک ایک ایسی دستاویز ہے جو بینک سے رقم نکلوانے کے لیے استعمال ہوتی ہے۔“ [اصول بنکاری: ص: ۱۹۵]

اس میں مرتب کنندہ (الساحب) کھاتہ دار ہوتا ہے اور مرتب الیہ (المسحوب علیہ) وہ بینک جس کے نام چیک جاری کیا جاتا ہے جب کہ وصول کنندہ (المستفید) وہ شخص ہوتا ہے جو بینک سے رقم وصول پاتا ہے وہ چیک جاری کرنے والا خود بھی ہو سکتا ہے اور کوئی دوسرا بھی۔ علاوہ ازیں چیک جاری کرتے وقت اس بات کا خاص خیال رکھا جاتا ہے کہ اس پر زیادہ سے زیادہ اتنی ہی رقم درج کی جائے جتنی کھاتے میں موجود ہو۔ اس سے تینوں کا باہمی فرق بھی واضح ہو گیا ہے۔ تفصیل کا یہاں موقع نہیں۔

شرعی حکم:

ان دستاویزات کے متعلق تین امور خاص طور پر تنقیح طلب ہیں۔

- ۱۔ باہمی لین دین کے وقت ان کو لکھنے کا حکم۔
  - ۲۔ بینک کے ذریعے ان کی وصولی اور اس پر بینک کے معاوضے کی شرعی حیثیت۔
  - ۳۔ میعاد پوری ہونے سے قبل ہنڈی پر پٹہ لگانے کا حکم۔
- ذیل میں بالترتیب ان کے جوابات ملاحظہ فرمائیں:
- ۱۔ لین دین کے وقت ان کی تحریر میں شرعاً کوئی امر مانع نہیں بلکہ بعض حالات میں تحریر شریعت کا تقاضا ہے جیسا کہ پرائیسری نوٹ کا معاملہ ہے۔ یہ اصل میں دین (Debt) کی دستاویز ہے جس کو لکھنے کا حکم قرآن نے دیا ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوهُ﴾ [البقرة: ۲۸۲]

”اے ایمان والو! جب تم آپس میں ایک مقررہ وقت تک ادھار کے ساتھ معاملہ کرو تو اسے لکھ لیا کرو۔“



ڈاکٹر علامہ عمر بن عبدالعزیز الممتزک رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

((فانہ لا محذور شرعاً فی تحریر ہذہ الاوراق لانہا اما وثیقة بدین کما فی السند الاذنی و تحریرہا مطلوب شرعاً للاستيثاق قال تعالیٰ: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوهُ﴾ [البقرة: ۲۸۲] واما حوالہ کما فی الكمبالیة، واما حوالہ و وكالة کما فی الشیخ، فالأمر فیہ مودع والمصرف مدين والشخص الثالث اما محال علی مدين او موکل فی الاستیفاء لحقہ و هذا مشروع فی الجملة))

”ان دستاویزات کی تحریر میں شرعاً کوئی مضائقہ نہیں کیونکہ یہ یا تو قرض کی دستاویزات ہیں جیسا کہ پرائیسری نوٹ ہے اطمینان کے لیے شرعاً اس کی تحریر کا مطالبہ ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿اے ایمان والو! جب تم آپس میں ایک مقررہ وقت تک ادھار کے ساتھ معاملہ کرو تو اسے لکھ لیا کرو۔﴾ یا حوالہ<sup>①</sup> ہے جیسا کہ ہنڈی ہے۔ یا حوالہ اور وکالہ ہے جیسا کہ چیک ہے اس میں حکم دینے والا ڈیپازٹر ہوتا ہے اور بینک کی حیثیت مقروض کی ہے۔ اور تیسرے شخص کی حیثیت یا تو محال یا حق کی وصولی کے لیے وکیل کی ہے اور یہ سب جائز ہیں۔“

① ”حوالہ شریعت کی ایک معروف اصطلاح ہے جس کا معنی ہے ”نقل دین من ذمۃ الی ذمۃ“ قرض کی

ذمہ داری ایک شخص سے دوسرے کی طرف منتقل کرنا۔“ [فتح الباری: ۴/۵۸۵]

یعنی مقروض خود قرض ادا کرنے کی بجائے قرض خواہ کو کسی دوسرے کے سپرد کر دے کہ اس سے وصول کر لینا اکثر کے نزدیک حوالہ صحیح ہونے کے لیے یہ ضروری ہے کہ جس کے حوالے کیا جا رہا ہو وہ اس پر رضا مند ہو۔ [فتح الباری: ۴/۵۸۵]

اسی طرح حوالہ میں یہ بھی ضروری ہے کہ جس کے حوالے کیا جا رہا ہے اس کے ذمہ حوالہ کرنے والا کا اتنا قرض ضرور ہو جتنا اس کے ذمہ اس شخص کا ہے جس کو یہ حوالے کر رہا ہے۔ واضح رہے ہنڈی صرف ایک صورت میں حوالہ بنتی ہے وہ ہے جب ہنڈی کے وصول کنندہ نے مرتب کنندہ کو قرض دے رکھا ہو اور مرتب کنندہ اسے مرتب الیہ کے حوالے کرے کہ آپ اس سے وصول پالیں۔

البتہ جن صورتوں میں دونوں طرف سے نقد ہونا شرط ہے جیسے بیع صرف یعنی روپے کا ڈالرو وغیرہ سے تبادلہ یا ایک طرف سے مجلس عقد میں مکمل ادائیگی ضروری ہو۔ جیسے بیع سلم<sup>①</sup> ہے۔ وہاں ہنڈی کا استعمال درست نہیں۔

بینک کی وساطت سے وصولی کا حکم:

ان کی وصولی میں بینک کی خدمات حاصل کرنے اور اس کے بدلے بینک کو کمیشن دینے میں شرعاً کوئی حرج نہیں۔ کیونکہ اس صورت میں بینک وصول کنندہ کا وکیل ہوتا ہے۔ چنانچہ علامہ ڈاکٹر عمر بن عبدالعزیز الممتزک رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

(( هذه العملية ظاهر فيها الجواز شرعا لان العمولة التي ياخذها المصرف هي اجرة او جعالة له على التحصيل وما يتطلبه من جهد ويتكلفه من مصاريف انتقال محصيله و ارسال الاخطارات لهم والاشعارات بسدادهم )) [الربا والمعاملات المصرفية: ص ۳۹۵]

”یہ کارروائی بظاہر شرعی طور پر جائز ہے کیونکہ بینک جو کمیشن لیتا ہے وہ وصولی کی خدمات سرانجام دینے کی اجرت یا حق محنت ہے۔ علاوہ ازیں وصولی کی کارروائی اور ادائیگی کے نوٹس وغیرہ بھیجنے پر اخراجات بھی آتے ہیں۔“

لہذا بینک کو اپنی خدمت کی اجرت اور اخراجات وصول کرنے کا حق ہے۔

ڈاکٹر علی احمد السالوس رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

(( والبنك يتعامل في هذه الاوراق من حيث الحفظ والتحصيل لحساب المستفيد كوكيل عنه الوكالة هنا باجر و العمولة التي ياخذ البنك يقابلها منفعة مشروعة ، وخدمة تؤدي هذا من الاعمال المصرفية الجائزة شرعا وما يؤخذ في نظيرها ليس من الربا ))

[المعاملات المالية المعاصرة: ص ۱۲۴]

① بیع سلم کا مفہوم یہ ہے کہ چیز کی قیمت پیشگی ادا کر دی جائے لیکن چیز بعد میں وصول پائی جائے اس میں مکمل قیمت پیشگی ادا کرنا لازمی شرط ہے۔“

”ان اوراق میں بینک کا کردار یہ ہے کہ وہ ان کی حفاظت کرتا ہے اور وصول کنندہ کے وکیل کی حیثیت سے وصول کر کے اس کے کھاتے میں جمع کرواتا ہے بینک کی یہ وکالت اجرت کے بدلے ہوتی ہے۔ چنانچہ بینک جو کمیشن لیتا ہے وہ ایک جائز فائدے اور خدمت کا بدلہ ہے بینکاری امور میں یہ عمل شرعاً جائز ہے۔ اس کے مقابلے میں جو کمیشن لیا جاتا ہے وہ سود نہیں۔“

ایک شبہ کا ازالہ:

یہاں ایک اشکال پیدا ہوتا ہے کہ اگر بینک وکیل ہے تو مال بینک کے پاس ضائع ہونے کی صورت میں بینک پر کوئی تاوان نہیں ہونا چاہیے بشرطیکہ اس کی کوتاہی یا غفلت شامل نہ ہو لیکن یہاں معاملہ اس کے برعکس ہے کہ بینک ہر صورت میں ضامن ہوتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ بینک اجیر مشترک ہے جو متعدد لوگوں کی وکالت کا فرض سرانجام دیتا ہے اور مشترک نقصان کی صورت میں ذمہ دار ہوتا ہے۔ شیخ الاسلام مولانا ثناء اللہ امرتسری رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

شریعت میں اجیر (کارکن) دو قسم کے ہیں:

۱۔ اجیر خاص۔

۲۔ اجیر مشترک۔

مثلاً کسی نے ایک دھوبی خاص اپنے لیے نوکر رکھا ہوا ہے اور دوسری قسم یہ ہے کہ دھوبی بہت سے لوگوں کے کپڑے دھوتا ہے۔ قسم اول سے کوئی نقصان اس کی لا پرواہی یا بددیانتی کے بغیر ہو جائے تو اس پر تاوان نہیں ہوتا قسم دوم پر ہوتا ہے۔ [فتاویٰ ثنائیہ: ۲/۴۴۶]

ہنڈی بھنانے کا حکم:

جیسا کہ اوپر بیان ہوا ہے کہ ہنڈی بھناتے وقت بینک ایک خاص شرح کے مطابق کٹوتی بھی کرتا ہے جب کہ کمیشن اور ڈاک اخراجات اس کے علاوہ ہوتے ہیں۔ یہ کٹوتی

اصل میں وہ سود ہوتا ہے جو بینک کو اس عرصہ میں اس رقم کے عوض حاصل ہونا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بٹہ لگانے کی شرح ہنڈی کی تاریخ ادائیگی کو سامنے رکھ کر مقرر کی جاتی ہے جوں جوں تاریخ ادائیگی قریب آتی جاتی ہے یہ شرح کم ہوتی جاتی ہے۔ جب اس کا سود ہونا ثابت ہو گیا تو اس کے حرام ہونے میں بھی کوئی شبہ نہیں رہتا۔

چنانچہ ڈاکٹر علی احمد السالوس رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

(( و اسواً اعمال البنك هنا اتخاذه الاوراق التجارية وسيلة للاقراض الربوى و ذلك عن طريق ما يسمى بالخصم ))

[المعاملات المالية المعاصرة، ص: ۱۲۴]

”یہاں بینک کا بدترین کردار کاروباری دستاویزات کو سودی قرض کا ذریعہ بنانا ہے

اور یہ ڈسکاؤنٹ کی صورت میں ہوتا ہے۔“

ڈاکٹر وہبہ زحیلی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

(( وهذه العملية حرام شرعا لانها قرض الربوى يتضمن فائدة ربوية عن المدة المستقبلية و يدخل تحت مفهوم ربا النساء المحرم شرعا لان البنك يدفع الاقل ليقبض فى نظيره اكثر منه بعد اجل وهو امر محظور شرعا باتفاق الفقهاء لوجود الربا فيه ))

[المعاملات المالية المعاصرة، ص: ۲۳۳]

”یہ عمل شرعی طور پر حرام ہے کیونکہ یہ سودی قرض ہے جو مستقبل کے عوض سودی فائدے

پر مشتمل ہے یہ ربا النسیئة کے مفہوم میں داخل ہے جو شرعاً حرام ہے۔ کیونکہ بینک

نے کم رقم دے کر کچھ مدت بعد اس کے عوض زیادہ حاصل کرنی ہے اس میں ربا کی

آمیزش ہونے کی وجہ سے فقہاء شرعی طور پر اس کے حرام ہونے پر متفق ہیں۔“

اسلامی فقہ اکیڈمی نے بھی ایک قرار داد (بمطابق ۱۹۹۲ء) میں اسے حرام قرار

دیا ہے۔ [حوالہ مذکورہ]

بعض شبہات کا ازالہ:

بعض حضرات یہ توجیہ کرتے ہیں کہ بینک اصل میں ہنڈی کے وصول کنندہ کا وکیل ہوتا ہے جس نے ہنڈی کے مرتب الیہ سے رقم وصول پا کر اس کے سپرد کرنا ہوتی ہے۔ ڈسکاؤنٹ کے بعد بینک جو رقم دے رہا ہے وہ اصل میں بینک کی طرف سے وصول کنندہ کی خدمت میں قرض ہے جو اس نے ہنڈی کی وصولی پر واپس کرنا ہوتا ہے جب کہ ڈسکاؤنٹ کی رقم بینک کا حق محنت ہے یوں یہ دو مختلف معاملات بن جاتے ہیں۔

- ۱۔ ہنڈی کے وصول کنندہ کا بینک کو اجرت پر وکیل مقرر کرنا۔
  - ۲۔ بینک کا ہنڈی پر تحریر شدہ رقم کے مساوی قرضہ فراہم کرنا اور وصول کنندہ کا بینک کو وصول ہونے والی رقم سے اپنا قرض واپس لینے کا اختیار دینا۔
- شرعی طور پر یہ دونوں معاملے جائز ہیں۔ اجرت پر وکیل بنانا بھی اور مشروط اضافہ کے بغیر قرض دینا بھی۔ یوں اس میں کوئی خرابی نہیں رہتی۔

جواب:

بظاہر یہ توجیہ بڑی دلکش معلوم ہوتی ہے لیکن اگر تھوڑا سا غور کیا جائے تو اس کی کمزوری بالکل عیاں ہے۔

✽ ایک تو اس لیے کہ بینک جو کٹوتی کرتا ہے وہ ادائیگی کی مدت سے وابستہ ہوتی ہے اگر وہ زیادہ ہوگی تو کٹوتی کی شرح بھی زیادہ۔ اور اگر وہ مدت کم ہوگی تو کٹوتی کی شرح بھی کم جیسا کہ اوپر بیان ہوا ہے۔ اگر یہ حق محنت ہے تو دونوں صورتوں میں فرق کیوں؟ جب کہ حق محنت دونوں صورتوں میں برابر ہے کٹوتی کو ادائیگی کی مدت سے وابستہ کرنا اس کے سود ہونے کی بین دلیل ہے۔

✽ دوسرا اس لیے کہ بینک جو کٹوتی کرتا ہے وہ ادائیگی کی تاریخ آنے سے پہلے ہوتی ہے اس کا مطلب ہے کہ بینک نے ابھی تک کوئی خدمت سرانجام نہیں دی لیکن حق

محنت وصول کر لیا ہے حالانکہ حق محنت کام پورا ہونے کے بعد دیا جاتا ہے۔  
 \* تیسرا اس لیے کہ یہ قرض وکالت کے معاوضہ کی صورت میں اضافی فائدہ کا باعث بن رہا ہے اور جس قرض سے فائدہ حاصل ہو وہ سود کے زمرے میں آتا ہے۔  
 چنانچہ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

((انہم نہوا عن قرض جرّ منفعة)) [ارواء الغلیل: ۵/۲۳۴]  
 ”انہوں نے اس قرض سے منع کیا جو فائدے کا باعث بن رہا ہو۔“

دوسرا شبہ:

دوسری توجیہ یہ کی جاتی ہے کہ حامل دستاویز اصل میں بینک کو وہ دستاویز کم قیمت پر فروخت کرتا ہے یعنی جب ہزار کی ہنڈی کے بدلے ۹۵۰ وصول پاتا ہے تو گویا ایک ہزار کو ۹۵۰ کے عوض فروخت کیا اور یہ جائز ہے۔

جواب:

یہ صورت ”بیع الدین علی غیر من ہو علیہ“ ”اس شخص کے ساتھ دین (قرض) کی بیع ہے جس پر دین نہیں ہے“ کہلاتی ہے۔ اگرچہ بعض فقہاء نے اس کو جائز قرار دیا ہے لیکن اس سے ہنڈی کے ڈسکاؤنٹ کا جواز ثابت نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس میں سود کی دونوں قسمیں ربا بالفضل اور بالنسیئة پائی جاتی ہیں۔ وہ اس طرح کہ یہاں درحقیقت نقد کی نقد ساتھ بیع ہے جس میں کمی بیشی اور ادھار دونوں سود شمار ہوتے ہیں جب کہ یہاں دونوں چیزیں ہی پائی جا رہی ہوتی ہیں۔ اس لیے یہ جائز نہیں۔

تیسرا شبہ:

بعض حضرات کے خیال میں اگر مرتب ایہ بٹہ لگانے والا بینک خود ہو تو اس کا مطلب ہوگا کہ قرض کی جلد ادائیگی کے بدلے اس کا کچھ حصہ چھوڑا جا رہا ہے۔ جیسا کہ

سعودی کبار علماء کے بورڈ کی رائے ہے۔ [ابحاث ہیئۃ کبار العلماء: ۵/۳۷۸]

اس کو اصطلاح میں ضَعُ وَتَعَجَّلُ ”چھوڑ دو اور جلد وصول کر لو“ کہا جاتا ہے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما حضرت ابراہیم نخعی اور امام ابو ثور رضی اللہ عنہما کے نزدیک بھی یہ جائز ہے۔ [مصنف عبدالرزاق: باب الرجل يضع من حقه ویتعجل، المغنی: ۶/۱۰۹]

حضرت عبداللہ بن محمد بن عبدالوہاب اور شیخ عبدالرحمن سعدی رضی اللہ عنہما بھی اس کو جائز قرار دیتے ہیں۔ [ابحاث ہیئۃ کبار العلماء: ۵/۳۷۹]

علامہ عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ بھی اسی کے قائل ہیں۔ [الربا والمعاملات المصرفية: ص: ۳۹۲]

جواب:

لیکن درج ذیل وجوہ کے باعث یہ رائے درست معلوم نہیں ہوتی۔

✽ ان حضرات کے برعکس صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تابعین عظام اور فقہاء محدثین کی غالب اکثریت ”ضَعُ وَتَعَجَّلُ“ کو ناجائز سمجھتی ہے۔ چنانچہ علامہ ابن قدامہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں

(( کرہہ زید بن ثابت، وابن عمر، والمقداد، سعید بن المسيب، سالم، والحسن، وحماد، والحکم، والشافعی، ومالك، والثوری، وهشيم، وابن عليه، واسحاق، وابو حنيفة ))

[المغنی: ۴/۱۰۹]

”حضرت زید بن ثابت، عبداللہ بن عمر، مقداد، سعید بن مسیب، سالم، حسن، حماد، حکم شافعی، مالک، ثوری، ہشیم، ابن علیہ، اسحاق، ابو حنیفہ رضی اللہ عنہم اس کو مکروہ سمجھتے ہیں۔“

ابوصالح رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

(( بَعْتُ بَزَالِي مِنْ أَهْلِ دَارِ نَخْلَةَ إِلَى أَجَلٍ ثُمَّ أَرَدْتُ الْخُرُوجَ ))



إِلَى الْكُوفَةِ فَعَرَضُوا عَلَيَّ أَنْ أَضَعَ عَنْهُمْ بَعْضَ الثَّمَنِ وَيَنْقُدُونِي  
فَسَأَلْتُ عَنْ ذَلِكَ زَيْدُ بْنُ ثَابِتٍ فَقَالَ لَا أَمْرُكَ أَنْ تَأْكُلَ هَذَا وَلَا

تُوكِلَهُ)) [موطا: كتاب البيوع، باب ما جاء في الربا في الدين]

”میں نے اہل نخلہ کو ادھار کپڑا فروخت کیا پھر میرا کوفہ جانے کا ارادہ بن گیا انہوں نے مجھے یہ پیشکش کی کہ میں کچھ قیمت کم کر دوں تو وہ باقی قیمت فوری ادا کر دیں گے۔ چنانچہ میں نے اس کے متعلق زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے پوچھا تو انہوں نے فرمایا میں آپ کو یہ مشورہ نہیں دیتا کہ آپ اس کو کھائیں یا دوسرے کو کھلائیں۔“

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے پوچھا گیا:

((عَنْ الرَّجُلِ يَكُونُ لَهُ الدَّيْنُ عَلَى الرَّجُلِ إِلَى أَجَلٍ فَيَضَعُ عَنْهُ  
صَاحِبُ الْحَقِّ وَيُعَجِّلُهُ الْآخِرُ فَكِرَهُ ذَلِكَ عَبْدُ اللَّهِ بْنُ عُمَرَ وَنَهَى

عَنْهُ)) [موطا امام مالك: باب ما جاء في الربا في الدين]

”ایک آدمی نے دوسرے سے ایک عرصہ بعد قرض لینا ہے۔ صاحب حق کچھ چھوڑ دیتا ہے اور دوسرا جلد ادا کر دیتا ہے تو انہوں نے اس کو ناپسند فرمایا اور اس سے منع فرمایا۔“

حضرت معمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

((وَلَا أَعْلَمُ أَحَدًا قَبْلَنَا إِلَّا وَهُوَ يَكْرَهُه)) [مصنف عبدالرزاق: باب

الرجل يضع من حقه و يتعجل]

”ہم سے پہلے تمام لوگ اس کو مکروہ سمجھتے تھے۔“

امام مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

((وَالْأَمْرُ الْمَكْرُوهَ الَّذِي لَا اخْتِلَافَ فِيهِ عِنْدَنَا أَنْ يَكُونَ لِلرَّجُلِ

عَلَى الرَّجُلِ الدَّيْنُ إِلَى أَجَلٍ فَيَضَعُ عَنْهُ الطَّالِبُ وَيُعَجِّلُهُ الْمَطْلُوبُ

وَذَلِكَ عِنْدَنَا بِمَنْزِلَةِ الَّذِي يُؤَخِّرُ دَيْنَهُ بَعْدَ مَحَلِّهِ عَنِ غَرِيمِهِ وَيَزِيدُهُ

الغريم في حقه قال: فهذا الربا بعينه لا شك فيه))

[موطا امام مالك: باب ما جاء في الربا في الدين]

”وہ معاملہ جو مکروہ ہے جس میں ہمارے نزدیک کوئی اختلاف نہیں وہ یہ ہے کہ آدمی نے دوسرے سے ادھار لینا ہو تو صاحبِ حق کچھ چھوڑ دے اور دوسرا جلد ادا کر دے یہ ہمارے نزدیک ایسے ہی ہے جیسے کوئی ادائیگی کی تاریخ آنے کے بعد قرض میں تاخیر کرے اور قرض خواہ اپنے حق میں اضافہ کر دے یہ بلاشبہ مبینہ سود ہے۔“

❁ دوسری وجہ یہ ہے کہ ہنڈی کی ڈسکاؤنٹ پر ”ضَعُ وَ تَعَجَّلُ“ کا اصول منطبق نہیں ہوتا۔ کیونکہ ”ضَعُ وَ تَعَجَّلُ“ میں جو رقم چھوڑی جاتی ہے اس کا انحصار قرض خواہ پر ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف ہنڈی میں ڈسکاؤنٹ کی شرح بینک طے کرتا ہے۔

❁ ”ضَعُ وَ تَعَجَّلُ“ میں مدت کا خیال نہیں رکھا جاتا جب کہ ڈسکاؤنٹ کی شرح مدت سامنے رکھ کر طے کی جاتی ہے۔ لہذا اس کو ”ضَعُ وَ تَعَجَّلُ“ کی بنیاد پر جائز قرار دینا درست نہیں۔



## حقوق (Rights) کی بیع

حق تالیف، حق ایجاد، رجسٹرڈ تجارتی نام و نشان کی خرید و فروخت اور پگڑی کا لین دین مالی معاملات کی وہ صورتیں ہیں جن کا قرآن و حدیث میں کوئی تذکرہ نہیں ملتا اور نہ ہی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، تابعین عظام اور ائمہ حدیث و فقہ رضی اللہ عنہم سے ان کے متعلق کوئی نص مروی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ مسائل خیر القرون سے کافی عرصہ بعد سامنے آئے۔ البتہ جن علماء کے دور میں یہ مسائل پیدا ہوئے انہوں نے کھل کر ان کے بارہ میں اپنے خیالات کا اظہار فرمایا۔ ذیل میں ہم ہر ایک کی مختصر تاریخ، مفہوم اور قرآن و حدیث کی اصولی ہدایات کی روشنی میں ان کا شرعی حکم بیان کرتے ہیں۔

حق التالیف:

ہر مؤلف کو اپنی تالیف سے متعلق دو قسم کے حقوق حاصل ہوتے ہیں:

(۱) ادبی (۲) مالی

ادبی کا اطلاق اس غیر مالی اختیار پر ہوتا ہے جس سے مؤلف کو درج ذیل دائمی اور ابدی حقوق حاصل ہوتے ہیں۔

✽ تالیف صرف اسی کی طرف منسوب ہوگی، کوئی دوسرا اپنا نام استعمال نہیں کر سکتا حتیٰ کہ خود مؤلف کو بھی یہ اختیار نہیں کہ وہ اپنی فکری کاوش دوسرے کے نام سے شائع کرے کیونکہ یہ جھوٹ کے زمرہ میں آتا ہے۔

✽ یہ فیصلہ کرنا بھی مؤلف کا اختیار ہوگا کہ کتاب کب شائع کرنی ہے؟ اور طباعت کا معیار کیا ہوگا۔

✽ دوبارہ اشاعت کی صورت میں حک و اضافہ کرنا۔

✽ اگر کوئی شخص ان ادبی اور مالی حقوق پر ڈاکہ ڈالے تو اس کا دفاع کرنا مؤلف اور اس کے ورثاء کا حق ہے۔

✽ اشاعت کے بعد اگر مؤلف یہ سمجھے کہ یہ مضمون اس کی آراء کے مطابق نہیں یا اس کی شخصیت کو نقصان پہنچا سکتا ہے تو بازار سے کتاب واپس لینے کی نگرانی کرنا۔ ایسی صورت میں ناشر کے نقصان کی تلافی کرنا مؤلف کی ذمہ داری ہوتی ہے۔

مالی حق کا مطلب ہے کہ کتاب کی اشاعت، تقسیم یا دوسرے ذرائع مثلاً سی ڈی یا آڈیو کیسٹ کے ذریعے بیان کرنے سے جو فوائد حاصل ہوں گے وہ بھی مؤلف کا حق ہیں۔ بسا اوقات مؤلف یہ حق فروخت بھی کر دیتا ہے۔ یہی فروخت اس وقت ہمارے زیر بحث ہے کہ آیا ایسا کرنا جائز ہے یا نہیں۔

### حق التالیف کی تاریخ:

اول الذکر یعنی ادبی حق تو ہر دور میں معتبر رہا ہے۔ کسی کی فکری کاوش کو اپنی طرف منسوب کرنا ہمیشہ معیوب سمجھا جاتا رہا ہے۔ امام ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

((و كحيل اللصوص و السراق على أخذ أموال الناس وهم انواع

لا تحصى فمنهم السراق بأيديهم ومنهم السراق بأقلامهم))

[اعلام الموقعین: ج ۳ ص ۱۰۷۶]

”حیلوں کے ذریعے لوگوں کا مال چرانے والوں کی بے شمار قسمیں ہیں۔ بعض

ہاتھوں سے چوری کرتے ہیں بعض قلموں کے ذریعے لوگوں کا مال چراتے ہیں۔“

علماء نے اس موضوع پر مستقل کتابیں بھی لکھی ہیں جن میں امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ کی

کتاب ”الفارق بین المصنف و السارق“ بھی شامل ہے۔

مالی حق کی شروعات پندرہویں صدی عیسوی کے آخر میں یورپ سے ہوتی ہے اور

یہی زمانہ پریس کی ایجاد کا ہے۔ اس کے حق میں اولین قانون ۱۷۰۹ء۔ ۱۱ کو برطانیہ

کے لارڈ ہاؤس نے پاس کیا پھر ۱۹۱۰ء-۲-۱۰ کو ملکہ برطانیہ کے دستخطوں سے فکری کاوشوں کے تحفظ کا قانون جاری ہوا۔

۱۷۹۱ء اور ۱۷۹۳ء کو فرانس میں اس کے حق میں قوانین بنائے گئے۔ ۱۷۸۹ء کو امریکا کی ایک ریاست Massachusetts اور ۱۷۹۰ء میں مرکز کی سطح پر اس کے حق میں قانون سازی ہوئی۔ [حقوق الاختراع والتأليف في الفقه الاسلامي ص: ۳۳۴]

اسلامی ممالک میں اس کے حق میں پہلی مرتبہ قانون سازی ۱۹۱۰ء میں عہد عثمانی میں ہوئی۔ بین الاقوامی سطح پر اس کے متعلق پہلا معاہدہ سویٹزر لینڈ کے دار الحکومت برن میں ۱۸۸۶ء میں ہوا۔ بعد میں مختلف کانفرنسوں میں اصلاحات ہوتی رہیں۔ اب تقریباً ہر ملک میں اس حق کو قانونی طور پر تسلیم کیا جاتا ہے۔

### حق ایجاد:

کسی شخص کو نئی چیز ایجاد کرنے کے بدلے جو حقوق حاصل ہوتے ہیں ان کو حقوق ایجاد کہا جاتا ہے۔ جیسے یہ حق کہ:

✽ وہ چیز اس کی ایجاد کردہ کہلائے گی۔ دوسرا شخص نہ تو اس کو اپنی جانب منسوب کر سکتا ہے اور نہ اس کی نقل تیار کر سکتا ہے۔

✽ اس کے مالی فوائد پر موجود اور پھر متعینہ مدت تک اس کے ورثاء کا حق ہوتا ہے۔

”اس کے حق میں اولین قانون ۱۷۷۲ء کو اٹلی میں بنا۔ ۱۶۲۳ء میں انگلینڈ ۱۷۹۱ء کو

فرانس اور ۱۸۱۵ء کو جرمنی کی بعض ریاستوں میں اس کے حق میں قوانین بنائے

گئے۔ البتہ پورے جرمنی میں اس کو قانونی تحفظ ۱۸۴۲ء کے بعد ملا۔ اسلامی ممالک

میں اس کی تاریخ عثمانی دور سے شروع ہوتی ہے۔“ [حقوق الاختراع والتأليف

في الفقه الاسلامي]

تجارتی نام اور علامات:

کسی کارخانہ کا وہ مخصوص نام جو اسے الگ شناخت دے اس کا تجارتی نام کہلاتا ہے۔ مصنوعات کی پہچان کے لیے مقرر کردہ مخصوص نشان کو تجارتی علامت (ٹریڈ مارک) کہا جاتا ہے۔ یہ متعلقہ تاجر کا حق شمار ہوتا ہے۔ قانوناً دوسرے کے لیے اس کا استعمال ممنوع ہوتا ہے۔ متعلقہ تاجر اگر چاہے تو یہ نام فروخت بھی کر سکتا ہے۔ اس کا ابتدائی دور انقلاب فرانس کا نواں (۹) سال ہے جب پیرس کی اپلیٹ کورٹ نے یہ فیصلہ دیا کہ جب کوئی شخص دکان فروخت کرتا ہے تو اس میں مادی ملکیت کے ساتھ ساتھ معنوی ملکیت بھی شامل ہوگی۔ [المعاملات المالية المعاصرة فى الفقه الاسلامی

للدكتور محمد عثمان شبير]

”معنوی“ سے مراد شہرت اور لوگوں کا اعتماد (Good will) ہے۔

معنوی حقوق کی بیع کا شرعی حکم:

ان حقوق کو حقوق معنویہ کہا جاتا ہے یعنی وہ اختیار جن کا تعلق مادی چیز سے نہ ہو ان کی بیع و شراء میں اختلاف ہے۔ علماء کا ایک گروہ اس کے جواز کا فتویٰ دیتا ہے تو دوسرا عدم جواز کو ترجیح دیتا ہے جب کہ بعض کے نزدیک مؤلف کو یہ حق تو پہنچتا ہے کہ وہ اپنی تالیف یا ایجاد سے مالی فائدہ اٹھائے یا شراکت کی بنیاد پر کسی سرمایہ کار کو اپنے ساتھ شامل کرے لیکن ان حقوق کی بیع درست نہیں۔ ان کا استدلال اس بات سے ہے کہ بیع کا مطلب ہے ہر قسم کے ملکیتی حقوق مشتری کی طرف منتقل ہو جائیں اس طرح کہ وہ چیز اس کی طرف منسوب ہو جائے شرعاً یہ جائز نہیں کہ چیز ملکیت کسی اور کی ہو لیکن اس کی نسبت دوسرے کی طرف ہو کیونکہ یہ جھوٹ اور فراڈ ہے۔ اس استدلال کا جواب یہ دیا گیا ہے یہ تب منع ہے جب خریدار ایجاد یا تالیف کی نسبت اپنی طرف منسوب کرے اگر یہ ہو

کہ کتاب لکھی تو فلاں نے ہے مگر یہ ملکیت فلاں کی ہے تو اس میں کوئی جھوٹ اور فراڈ نہیں ہے۔

اس کا دوسرا جواب یہ ہے کہ لوگ ہمیشہ سے اپنی کتب وقف اور ہدیہ کرتے رہے ہیں نام مؤلف کا ہی ہوتا تھا۔ متقدمین میں سے کسی نے اس کو ناجائز قرار نہیں دیا۔

[حقوق الاختراع والتأليف في الفقه الاسلامي]

شیخ بکر بن عبداللہ ابوزید رضی اللہ عنہ نے قائلین اور مانعین کے دلائل بڑی تفصیل سے بیان فرمائے ہیں ذیل میں ہم ان کے حوالے سے فریقین کے بعض دلائل نقل کرتے ہیں۔  
قائلین کے دلائل:

✽ یہ ان حقوق کی طرح ہیں جو انسان کو اپنے بدن، حواس اور جذبات سے متعلق تکوینی اور جبلی تصرفات کے بارہ میں حاصل ہیں۔

✽ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((إِنَّ أَحَقَّ مَا أَخَذْتُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا كِتَابُ اللَّهِ)) [صحیح بخاری: باب

الشَّرْطِ فِي الرُّقِيَةِ بِقَطِيعٍ مِنَ الْغَنَمِ]

”سب سے زیادہ حق دار جس پر تم اجرت لو اللہ کی کتاب ہے“

جب قرآن کا معاوضہ لینا جائز ہے تو دوسری کتب کا بالاولیٰ جائز ہوگا۔

✽ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کی تعلیم کو حق مہر مقرر کر کے ایک صحابی کا نکاح پڑھایا۔ جب

قرآن کی تعلیم مہر بن سکتی ہے تو اس کی نشر و اشاعت کا معاوضہ کیوں نہیں لیا جاسکتا؟

✽ رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا۔

((أَيُّ الْكَسْبِ أَطْيَبُ قَالَ عَمَلُ الرَّجُلِ بِيَدِهِ وَكُلُّ بَيْعٍ مَبْرُورٍ))

[مسند احمد: ۱۷۷۲۸]

”کون سی کمائی بہتر ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا انسان کا اپنے ہاتھ سے کمانا اور ہر

مبرور بیع۔“



✽ علمائے سلف سے بھی کتب کا معاوضہ لینا ثابت ہے۔ ابو نعیم اصفہانی رحمۃ اللہ علیہ نے چار (۴۰۰) سو دینار لے کر اپنی کتاب ”الحلیۃ“ پیچی۔ یہ چار سو دینار ورق اور لکھنے کی قیمت تو نہیں ہو سکتے۔ اسی طرح جب مختلف علاقوں کے حکمرانوں نے اپنے علماء کے ذریعے علامہ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ سے ان کی کتاب کے نسخے منگوائے تو انہوں نے تین سو (۳۰۰) دینار وصول کر کے دیئے۔

✽ کتاب مصنف کی ملکیت ہوتی ہے لہذا اس کو ہر قسم کا اختیار ہے ہبہ کرے یا وقف کرے یا فروخت۔

✽ حق تالیف حقوق مقررہ میں سے ہے نہ کہ حقوق مجردہ (Abstract Rights) سے۔ کیونکہ حق مجردہ ہوتا ہے جس کو شارع نے دفع ضرر کے لئے مشروع قرار دیا ہو جیسے حق شفعہ۔

حق مقررہ ہوتا ہے جو شروع ہی سے حق دار کے لیے ثابت ہو اس قسم کے حق کا معاوضہ لیا جاسکتا ہے۔ حق تالیف اسی قبیل سے ہے۔

مانعین کے دلائل:

جو حضرات ان حقوق کی خرید و فروخت کے مخالف ہیں ان کے دلائل حسب ذیل ہیں:

✽ علم عبادت ہے، صنعت و تجارت نہیں اور عبادت کا معاوضہ درست نہیں۔

✽ اس سے کتمان علم لازم آتا ہے جو حرام ہے۔

✽ یہ حق مجرد ہے اور حق مجرد کا معاوضہ صحیح نہیں۔ [فقہ النوازل: ج ۲ ص ۱۷۱، ۱۸۳]

راجح رائے:

اگر فریقین کے دلائل کا تجزیہ کیا جائے تو تین وجوہ کے باعث ان لوگوں کی رائے صائب معلوم ہوتی ہے جو اس کے حق میں ہیں:

۱۔ مانعین نے اپنی تائید میں جو دلائل ذکر کئے ہیں وہ اس ثبوت کے لیے کافی و شافی

نہیں ہیں مصنف اگر کتاب پر حقوق الطبع محفوظ ہیں لکھ دیتا ہے تو اس کا یہ مطلب قطعاً نہیں ہوتا کہ وہ علم چھپانا چاہتا ہے اس کا مقصد تو صرف ناشر کو اس بات کا پابند بنانا ہوتا ہے کہ وہ تنہا ہی اس سے فائدہ نہ اٹھائے بلکہ مؤلف کا بھی خیال رکھے۔ مانعین کا یہ کہنا بھی درست نہیں کہ یہ طاعت ہے نہ کہ تجارت اس لیے اس کا معاوضہ نہیں لیا جاسکتا۔ کیونکہ طاعات کی اجرت کا ثبوت حدیث سے بھی ثابت ہے اور فقہاء سے بھی۔ اس کو حق شفعہ پر بھی قیاس نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ حق شفعہ کا مقصد دوسرے کو ضرر سے محفوظ رکھنا ہے جب کوئی یہ حق فروخت کرتا ہے تو اس کا مطلب ہوتا ہے کہ دوسرے کو بیچنے سے اس کا کوئی نقصان نہیں۔ لہذا اس کا معاوضہ لینا جائز نہیں۔ جب کہ زیر بحث حق دفع ضرر کے لیے نہیں بلکہ فکری و عملی محنت کا عوض ہے۔

۲۔ جمہور فقہاء کے نزدیک مال کا اطلاق ہر اس چیز پر ہوتا ہے جس سے عام حالات میں فائدہ اٹھایا جائے، اس حق کے قابل انتفاع ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔

۳۔ ٹریڈ مارک اور تجارتی نام رجسٹرڈ کروانے میں محنت کے علاوہ اچھا خاصا سرمایہ بھی خرچ کیا جاتا ہے اس لیے ان کو فروخت کرنا جائز ہے۔ اسلامی فقہ اکیڈمی نے اپنے پانچویں اجلاس جو دس سے پندرہ دسمبر ۱۹۸۸ء کو کویت میں منعقد ہوانے بھی اس کے حق میں رائے دی ہے۔ اجلاس کی قرارداد کے الفاظ یوں ہیں:

أولاً: الاسم التجاري والعنوان التجاري والعلامة التجارية والتأليف والاختراع والابتكار: هي حقوق خاصة لأصحابها وأصبح لها في العرف المعاصر قيمة مالية معتبرة لتمول الناس لها وهذه الحقوق يعتد بها شرعاً فلا يجوز الاعتداء عليها۔

ثانياً: يجوز التصرف في الاسم التجاري أو العنوان التجاري أو العلامة التجارية و نقل أي منها بعوض مالي إذا انتفى الغرر

والتدليس و الغش باعتبار أن ذلك أصبح حقا ماليا -  
 ثالثا: حقوق التأليف والاختراع او الابتكار مصنونة شرعا و  
 لاصحابها حق التصرف فيها ولا يجوز الاعتداء عليها ((  
 [بحواله موسوعة القضا يا لفقهيّة المعاصرة للدكتور على احمد

سالوس: ص 618، 619]

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ تجارتی نام، عنوان اور تجارتی علامت، حق تالیف اور ایجاد وہ  
 حقوق ہیں جو اپنے مالکان کے لیے خاص ہیں۔ دور حاضر کے عرف میں ان کی ایک معتبر  
 مالی قیمت ہے اس لیے ان حقوق کو مالی معاوضہ کے بدلے دوسرے کے نام منتقل کرنا جائز  
 ہے بشرطیکہ غرض تدلیس اور دھوکے سے پاک ہوں۔ لہذا ان کے مالکان کو ان میں تصرف  
 کا حق ہے اور ان حقوق پر زیادتی نہیں ہو سکتی۔



## پگڑی

پگڑی کا لین دین بھی ان مسائل میں سے ہے جن پر ہر بڑے شہر میں عمل ہو رہا ہے۔ عربی میں پگڑی کے لئے ”خلو“ کا لفظ آیا ہے۔ جس کا معنی ہے خالی ہونا۔ علامہ زرقانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی عمومی تعریف یوں کی ہے:

(( هو اسم لما يملكه دافع الدرهم من المنفعة التي دفع في مقابلتها الدرهم )) [الموسوعة الفقهية، المادة خلو]  
 ”درہم ادا کرنے والے کی زیر ملکیت وہ منفعت جس کے بدلے اس نے درہم ادا کیے ہوں۔“

پگڑی جس طرح ذاتی پراپرٹی میں ہوتی ہے اسی طرح وقف اور بیت المال کی اراضی میں بھی ہوتی ہے۔

اراضی وقف میں پگڑی کی صورتیں:

وہ منفعت جو وقف کے کرایہ دار نے ناظر وقف کو تعمیر کی غرض سے کچھ رقم ادا کر کے اس شرط پر حاصل کی ہوتی ہے کہ وہ وقف کی منفعت کے فیصد کے حساب سے ایک متعین حصہ مثلاً نصف یا ثلث کا مالک ہوگا اور باقی حصہ کا کرایہ ادا کرے گا۔

اراضی بیت المال میں پگڑی کی صورت:

سرکاری زمین کے کرایہ دار کا وہ حق جو اسے سرکاری زمین میں درخت لگانے تعمیراتی کام کرنے یا مٹی ڈالنے کی وجہ سے زمین پر قبضہ باقی رکھنے کی صورت میں حاصل ہوتا ہے۔ بشرطیکہ اس زمین کے حقوق خزانے کو ادا کرتا رہے۔ [الموسوعة الفقهية]

مگر ہمارے پیش نظر یہاں صرف ذاتی پراپرٹی میں پگڑی کا حکم معلوم کرنا ہے۔

ذاتی پراپرٹی میں پگڑی کا مفہوم:

وہ ناقابل واپسی رقم جو دکان یا مکان کا مالک کرایہ دار سے ماہانہ کرایہ کے علاوہ ایک مشنت وصول کرتا ہے۔ اس کے بعد مالک برائے نام مالک رہ جاتا ہے وہ دکان وغیرہ میں کسی قسم کا تصرف نہیں کر سکتا۔ ملکیت نامہ رکھنے کے باوجود نہ دکان خالی کروا سکتا ہے اور نہ دوسرے کو کرایہ پردے سکتا ہے تا وقتیکہ کرایہ دار اس پر آمادہ نہ ہو اور مالک مارکیٹ ریٹ کے مطابق کرایہ دار کو پگڑی ادا نہ کر دے۔

پگڑی کی صورت میں دکان یا مکان کی مرمت وغیرہ حتی کہ اگر کسی وجہ سے دکان گر جائے اس کو دوبارہ تعمیر کرنا کرایہ دار کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ اگر کرایہ دار چاہے تو پگڑی بیچ کر قبضہ دوسرے کے حوالے بھی کر سکتا ہے۔ اس صورت میں بعض دفعہ مالک سابق کرایہ دار سے پگڑی کا کچھ فیصد بھی وصول کرتا ہے۔ پگڑی کی صورت میں کرایہ مارکیٹ ریٹ سے کافی کم ہوتا ہے

پگڑی کا فائدہ:

اس میں مالک اور کرایہ دار ہر دو کا فائدہ ہے۔ کرایہ دار کا اس طرح کہ اس کو یہ اندیشہ نہیں رہتا کہ مالک جب چاہے گا دکان خالی کروالے گا۔ مالک کا اس طرح کہ وہ خود کو کرایہ دار کی زیادتی سے محفوظ سمجھتا ہے کیونکہ وہ پگڑی کے نام پر ایک معقول رقم پہلے ہی وصول کر چکا ہوتا ہے جب کہ باقی کرایہ کی صورت میں وصول کر رہا ہوتا ہے۔

پگڑی کے مختلف نام:

عربی میں پگڑی کو عام طور پر "الخلو" کہا جاتا ہے۔ تاہم بعض ممالک میں دوسرے ناموں سے بھی معروف ہے۔ عراق میں اس کو "السر قفلیة" (فارسی لفظ) کہتے ہیں اس کا مفہوم یہ ہے کہ کرایہ دار معاوضہ لے کر دوسرے کے حق میں دستبردار ہو جائے۔

شام میں "الفروغ" کہتے ہیں یعنی خالی کروانا۔ خلو کے لغوی معنی میں استعمال ہوا ہے۔

مصر میں "المفتاح" یا "الزينة" کہا جاتا ہے۔

مفتاح کا لغوی معنی ہے چابی۔ پگڑی ادا کرنے کے بعد کرایہ دار تصرف کا مالک بن جاتا ہے اس لیے مفتاح کا نام دیا گیا۔

زینة کا معنی ہے "ڈیکوریشن" پگڑی ادا کر کے کرایہ دار مستقل رہنے کے لیے دکان سجاتا ہے اس لیے الزينة کہا جاتا ہے۔

مغرب یعنی تونس، الجزائر وغیرہ میں "الجلسة" کے نام سے معروف ہے جس کا معنی ہے بیٹھنا۔ پگڑی کے بعد کرایہ دار کورہائش کا مستقل حق مل جاتا ہے اس لیے "الجلسة" کا نام دیا جاتا ہے: [المعاملات المالية المعاصرة في الفقه

الاسلامی للدكتور محمد عثمان شبير]

پگڑی کی تاریخ و ارتقاء:

اگرچہ قرآن و حدیث اور ائمہ حدیث و فقہ کے دور میں پگڑی کا ذکر نہیں ملتا لیکن اس کا یہ معنی بھی نہیں کہ یہ عصر حاضر کی پیداوار ہے بلکہ اس کا تصور کئی صدیاں پرانا ہے۔

چنانچہ ڈاکٹر وہبہ زحیلی رحمۃ اللہ علیہا لکھتے ہیں

((واول ظهور مسألة النخلو كان في الاندلس في اواخر القرن

التاسع الهجري في مجال عقارات الاوقاف التي تحتاج الى

ترميم واصلاح وعمارة وبناء وزراعة واستثمار)) [المعاملات

المالية المعاصرة: ص ۵۶۱]

سب سے پہلے پگڑی کا آغاز نویں صدی ہجری میں اندلس میں اوقاف کی ان زمینوں

سے ہوا جو ترمیم و اصلاح، عمارت و بناء اور زراعت و سرمایہ کاری کی متقاضی تھیں۔

دسویں صدی ہجری کے مالکی فقیہ ابو عبد اللہ محمد بن الحسن اللقانی (۸۷۳ تا ۹۵۸) کا

اس موضوع پر ایک فتویٰ بھی ہے جس کے متعلق علامہ حموی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

((وان نوزع فيه وقد اشتهرت فتياه في المشارق والمغرب و  
 تلقاها علماء عصره بالقبول و هبت عليها نسيمات الصبا والقبول))  
 [غمز عيون البصائر في شرح الاشتباه والنظائر: ج ۲، ص: ۱۷۳]  
 ”اگرچہ اس کے متعلق ان سے اختلاف کیا گیا ہے لیکن ان کا فتویٰ مشرق و مغرب  
 میں مقبول ہے اور اس دور کے علماء نے اسے قبولیت بخشی ہے اور اس پر شوق و  
 قبولیت کی ہوا کے جھونکے چلے ہیں۔“

دسویں صدی ہجری کے نصف اول تک قاہرہ کی مارکیٹوں میں اس کا خاصا  
 رواج ہو چکا تھا۔

چنانچہ علامہ ابن نجیم مصری رحمۃ اللہ علیہ رقم طراز ہیں:

((فأقول على اعتباره: ينبغي أن يفتى بأن ما يقع في بعض أسواق  
 القاهرة من خلو الحوانيت لازم ويصير الخلو في الحانوت حقاله  
 فلا يملك صاحب الحانوت اخراجه منها ولا اجارتهالغيره ولو  
 كانت وقفا)) [الاشتباه والنظائر مع غمز عيون البصائر: ج ۲، ص ۱۶۸]  
 ”میں کہتا ہوں کہ عرف خاص کا اعتبار کر کے قاہرہ کے بعض بازاروں میں دکانوں  
 میں رائج پگڑی کے جواز کا فتویٰ دینا چاہیے اور یہ فتویٰ دینا چاہیے کہ پگڑی کرایہ دار  
 کا حق ہے۔ دکان کا مالک نہ تو اس کو نکال سکتا ہے اور نہ کسی دوسرے کو دے سکتا ہے  
 خواہ وہ وقف ہی کیوں نہ ہو۔“  
 مزید لکھتے ہیں:

((وقد وقع في حوانيت الجمelon بالغورية أن السلطان  
 الغوري لما بناها أسكنها للتجار بالخلو)) [ايضاً۔ ج ۲، ص ۱۶۸]  
 ”سلطان غوری نے غوریہ میں جب جملون کی دکانیں تعمیر کیں تو تاجروں کو پگڑی پر  
 دی تھیں۔“

## پگڑی کا حکم:

پگڑی کی رقم کس چیز کا معاوضہ ہے، اس بارہ میں علماء کے مختلف نقطہ ہائے نظر ہیں درست رائے کے مطابق یہ درحقیقت مالک کے اس حق کا معاوضہ ہے جو اسے دکان خالی کروانے اور دوسرے کو کرایہ پر دینے کی صورت میں حاصل تھا۔ کرایہ دار پگڑی ادا کر کے یہ حق خرید لیتا ہے تاہم اس کا جواز اس امر پر موقوف ہے کہ آیا اس سے کسی شرعی اصول کی خلاف ورزی تو لازم نہیں آتی۔ ہمارے خیال میں درج ذیل وجوہ کے باعث اس کا جواز محل نظر ہے۔

❁ بنیادی طور پر یہ اجارہ کا معاہدہ ہے جس میں کرایہ پردی ہوئی چیز کرایہ دار کے پاس امانت ہوتی ہے۔ نقصان کا ذمہ دار خود مالک ہوتا ہے بشرطیکہ اس میں کرایہ دار کی زیادتی یا معاہدے کی خلاف ورزی کا دخل نہ ہو۔ چنانچہ الموسوعة الفقیہة میں ہے۔

((والدار المستأجرة تكون أمانة في يد المستأجر فلا يضمن  
الاب بالتعدى أو المنخالفه))

”کرایہ پر دیا ہوا گھر کرایہ دار کے پاس امانت ہوتا ہے وہ صرف زیادتی اور معاہدے کی خلاف ورزی کی صورت میں نقصان کا ذمہ دار ہوگا۔“

پگڑی میں اس بات کا لحاظ نہیں رکھا جاتا۔ اسی طرح گھر کی ایسی مرمت جس سے رہائش میں خلل واقع ہوتا ہو وہ بھی مالک کی ذمہ داری ہوتی ہے جیسا کہ ”الموسوعة الفقیہة“ میں ہے۔

((كما يلزم الموجهر عمارة الدار اصلاح كل ما ينخل بالسكنى فان  
أبى حق المستأجر فسخ العقد الا اذا كان استأجرها على حالها))  
”گھر کی تعمیر اور رہائش میں محل نقصان کی اصلاح کرایہ پردینے والے کی ذمہ داری



ہے، اگر وہ انکار کرے تو کرایہ دار کو عقد فسخ کرنے کا حق ہے الا کہ انہوں نے اجارہ ہی اس حالت پر کیا ہو۔“

پگڑی کی صورت میں مالک بالکل بے تعلق ہو جاتا ہے کرایہ دار جانے اور مکان۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ مرمت وغیرہ کی ذمہ داری معاہدے میں شرط ہوتی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ فقہاء کے نزدیک ایسی شرط سے اجارہ فاسد ہو جاتا ہے۔ چنانچہ علامہ سرحسی حنفی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

((فان اشترط المرمۃ علی المستأجر فسدت الاجارة لان

المرمۃ علی الآخر)) [المبسوط: ج ۱۵ ص ۱۵۷]

”اگر یہ شرط لگائے کہ مرمت کرایہ دار کی ذمہ داری ہوگی تو اجارہ فاسد ہو جائے گا کیونکہ مرمت کرایہ پر دینے والے کی ذمہ داری ہے۔“

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا گیا ایک آدمی اس شرط پر مکان کرایہ پر دیتا ہے کہ اس کی لکڑی ٹوٹی یا گھر کو معمولی مرمت کی ضرورت پیش آئی تو یہ کرایہ دار کی ذمہ داری ہوگی؟ تو انہوں نے فرمایا:

((لا خیر فی ذلك الا ان یشرط من کرائها))

[المدونة الكبرى: ج ۱۱، ص ۵۰۹]

”اس میں کوئی خیر نہیں الا کہ ان اخراجات کو کرایے سے منہا کرنے کی شرط ہو تو پھر جائز ہے۔“

✽ اجارہ کی مدت متعین ہونی چاہیے۔ الموسوعة الفقیہة میں ہے۔

((وبیان المنفعة فی اجارة الدور ببيان المدة فقط))

”گھروں کے اجارہ میں منفعت کی وضاحت فقط اجارہ کی بیان کرنے سے ہوگی۔“

پگڑی میں اجارہ غیر محدود وقت کے لیے ہوتا ہے۔

بعض حضرات کے خیال میں یہاں مدت مجہول نہیں بلکہ یہ ابدی اجارہ ہے مگر اس پر

سوال پیدا ہوتا ہے کیا شریعت میں ابدی اجارہ کا تصور پایا جاتا ہے؟ فقہ حنبلی کی معروف کتاب ”زاد المستنقع“ میں بیع کی تعریف میں ”على التأييد“ کے الفاظ ذکر ہوئے ہیں۔ امام بہوتی رحمۃ اللہ علیہ اس کی شرح میں فرماتے ہیں:

((ينخرج الاجارة)) [الروض المربع: ص ۲۷۵]

”یہ قید اجارہ کو بیع سے خارج کر رہی ہے۔“

یعنی بیع ابدی ہوتی ہے جبکہ اجارہ محدود مدت کے لیے۔

ڈاکٹر وہبہ زحیلی رحمۃ اللہ علیہا لکھتے ہیں:

((وعلى واضعى القوانين الاجارية اعادة النظر مسألتي تأييد الاجارة وتجميد الاجرة لان اجارة محدودة المدة وتعتمد على التراضى بين المالك والمستأجر ولان تجميد الاجرة ينافى العدل)) [المعاملات المالية المعاصرة: ص ۵۶۷]

”اجارہ کے قوانین وضع کرنے والوں پر لازم ہے کہ وہ ابدی اجارے اور اجرت منجمد کرنے کے مسئلہ پر نظر ثانی کریں کیونکہ اجارہ محدود مدت کے لیے ہوتا ہے مالک اور کرایہ دار کی رضامندی پر منحصر ہوتا ہے اور اس لیے بھی کہ اجرت منجمد کرنا عدل کے منافی ہے۔“

✽ تمام فقہاء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ درج ذیل صورتوں میں عقد اجارہ ختم ہو جاتا ہے۔

۱۔ مدت ختم ہو جائے۔

۲۔ اجارہ پردی ہوئی چیز تباہ ہو جائے۔

۳۔ اجارہ واپس کرنے کی صورت میں۔

چنانچہ الموسوعة الفقيهية میں ہے:

((اتفق الفقهاء على ان الاجارة تنتهى بانتهاء المدة أو بهلاك

المعقود عليه المعين أو بالاقالة))

”فقہاء اس بات پر متفق ہیں کہ اجارہ مدت ختم ہونے یا اجارہ پردی ہوئی چیز تباہ ہو جانے یا اجارہ واپس کرنے کی صورت میں ختم ہو جاتا ہے۔“

پگڑی میں یہ بات نہیں ہوتی بلکہ اگر کسی وجہ سے دکان گر بھی جائے تو کرایہ دار کو کرایہ ادا کرنا پڑتا ہے اور دکان کی دوبارہ تعمیر بھی اس کی ذمہ داری ہوتی ہے۔

بعض کی رائے میں پگڑی سے مالک جائیداد اپنے حق تصرف سے بھی محروم ہو جاتا ہے۔ قائلین اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ مالک نے یہ شرط از خود قبول کی ہوتی ہے اور اس کا معاوضہ بھی وصول کیا ہوتا ہے۔

ملاحظہ:

بعض دفعہ مالک طے شدہ مدت سے پہلے ہی دکان خالی کروانا چاہتا ہے کرایہ دار اس وقت تک خالی کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا جب تک مالک کچھ رقم ادا نہ کر دے اس کو بھی پگڑی کہہ دیتے ہیں۔ مگر یہ جائز ہے کیونکہ طے شدہ مدت تک وہاں رہنا کرایہ دار کا حق ہے جو سلب نہیں کیا جاسکتا۔ اگر مالک وقت سے پہلے قبضہ لینا چاہتا ہے تو کرایہ دار کے لیے اس حق کا معاوضہ لینا جائز ہے۔



## قسطوں پر خرید و فروخت

دور حاضر میں جن معاملات کو وسیع پیمانے پر فروغ حاصل ہوا ہے ان میں قسطوں پر خرید و فروخت بھی شامل ہے اس کو عربی میں ”البيع بالتقسيط“ کہا جاتا ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ چیز تو فوراً مشتری کے حوالے کر دی جائے مگر اس کی قیمت طے شدہ اقساط میں وصول کی جائے قسط کو نجوم بھی کہتے ہیں۔ جس کا معنی ہے ”ستارہ“ شارح بخاری علامہ وحید الزماں رحمۃ اللہ علیہ اس کی وجہ تسمیہ میں فرماتے ہیں:

”عرب میں تمام معاملات تاروں کے طلوع پر ہوا کرتے تھے کیونکہ وہ حساب نہیں جانتے تھے وہ یوں کہتے تھے کہ جب فلاں تارہ نکلے گا تو یہ معاملہ ہوگا اسی وجہ سے قسط کو نجوم کہنے لگے۔“ [تیسیر الباری: ج ۲، ص ۶۲۶]

بعض لوگ اس کو موجودہ دور کی ایجاد سمجھتے ہیں جو درست نہیں اس کا رواج تو عہد رسالت و صحابہ میں بھی موجود تھا جیسا کہ ذیل کے دو واقعات سے ثابت ہوتا ہے

پہلا واقعہ:

((عَنْ عَمْرِو بْنِ الشَّرِيدِ قَالَ وَقَفْتُ عَلَى سَعْدِ بْنِ أَبِي وَقَّاصٍ فَجَاءَ الْمِسُورِيُّ مَخْرَمَةً فَوَضَعَ يَدَهُ عَلَى إِحْدَى مَنَكِبَيْ إِدْجَاءَ أَبُو رَافِعٍ مَوْلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ يَا سَعْدُ ائْتِعْ مِنِّي بَيْتِي فِي دَارِكَ فَقَالَ سَعْدُ: وَاللَّهِ مَا أَتَّاعُهُمَا فَقَالَ الْمِسُورِيُّ: وَاللَّهِ لَتَبْتَاعَهُمَا فَقَالَ سَعْدُ: وَاللَّهِ لَا أَزِيدُكَ عَلَى أَرْبَعَةِ الْأَفِ مَنَجَمَةٍ أَوْ مَقْطَعَةٍ قَالَ أَبُو رَافِعٍ: لَقَدْ أُعْطِيتُ بِهَا خُمْسَ مِائَةِ دِينَارٍ وَلَوْ لَا أَنِّي سَمِعْتُ

رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ: ((الْجَارُ أَحَقُّ بِسَقْبِهِ)) مَا  
أَعْطَيْتُكَهَا بِأَرْبَعَةِ آلَافٍ وَأَنَا أُعْطِيَ بِهَا خُمْسَ مِائَةِ دِينَارٍ))

[صحیح بخاری: باب عرض الشفعة علی صاحبها قبل البیع]  
”عمر بن شریک کہتے ہیں کہ میں سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے پاس کھڑا تھا، اتنے میں مسور بن مخرمہ آئے انھوں نے اپنا ہاتھ میرے کندھے پر رکھا۔ اتنے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام ابورافع آگئے۔ انہوں نے کہا: اے سعد آپ کے محلے میں میرے جو دو گھر ہیں وہ آپ خرید لیں۔ سعد نے کہا: اللہ کی قسم: میں نہیں خریدتا۔ حضرت مسور نے کہا کہ اللہ کی قسم آپ کو ضرور خریدنا ہوں گے۔ تب سعد نے کہا میں چار ہزار درہم سے زائد نہیں دوں گا وہ بھی قسطوں میں۔ ابورافع نے کہا کہ مجھے ان گھروں کے پانچ سو دینار (نقد) ملتے تھے اور اگر میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے نہ سنا ہوتا کہ پڑوسی اپنے قرب کی وجہ سے زیادہ حق دار ہے تو میں آپ کو یہ گھر چار ہزار درہم میں بھی نہ دیتا۔ جب کہ مجھے ان کے پانچ سو دینار (نقد) ملتے تھے۔“

دوسرا واقعہ:

(( قَالَ عُرْوَةُ: قَالَتْ عَائِشَةُ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا إِنَّ بَرِيرَةَ دَخَلَتْ  
عَلَيْهَا تَسْتَعِينُهَا فِي كِتَابَتِهَا وَعَلَيْهَا خُمْسَةُ أَوَاقٍ نُجْمَتْ عَلَيْهَا فِي  
خُمْسِ سِنِينَ)) [صحیح بخاری: کتاب المکاتب]

”عروہ کا بیان ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: بریرہ رضی اللہ عنہا ان کے پاس اپنی مکاتب میں مدد کے سلسلے میں حاضر ہوئی اس کے ذمہ پانچ اوقیہ چاندی تھی جو اس نے پانچ سالانہ اقساط میں ادا کرنا تھی۔“

امام بخاری رضی اللہ عنہ نے صحیح بخاری میں اس پر بایں الفاظ عنوان قائم کیا ہے:

((باب المکاتب ونجومه فی کل سنة نجم))

”مکاتب اور اس کی قسطوں کا بیان ہر سال میں ایک قسط۔“

بیع قسط چونکہ بیع مؤجل ہی کی ایک شکل ہے۔ جس میں چیز کی قیمت بیک مشت ادا کرنے کی بجائے اقساط مقرر کر دی جاتی ہیں۔ اس لے ہمارے فقہاء نے اس کو الگ عنوان میں ذکر کرنے کی بجائے عموماً بیع مؤجل کے ضمن میں ہی بیان کیا ہے۔

قسطوں پر خریداری کی مختلف صورتیں:

ادھار یا قسطوں پر خریداری کی دو صورتیں ہیں:

۱۔ نقد اور ادھار دونوں صورتوں میں ایک ہی قیمت ہو۔ ایسا شاذ و نادر ہوتا ہے تاہم اس کے جواز میں کوئی کلام نہیں۔

۲۔ ادھار میں نقد سے زیادہ قیمت وصول کی جائے۔ مثلاً یوں کہا جائے کہ یہ چیز نقد سو روپے کی اور ادھار ایک سو دس کی ہوگی۔ اس کے بارہ میں تین نقطہ نظر ہیں۔

(۱) جمہور فقہاء و محدثین رحمہم اللہ کی رائے میں یہ جائز ہے۔

چنانچہ امام شوکانی رحمہم اللہ فرماتے ہیں:

((وَقَالَتُ الشَّافِعِيَّةُ وَالْحَنَفِيَّةُ وَزَيْدُ بْنُ عَلِيٍّ وَالْمُؤَيَّدُ بِاللَّهِ

وَالْجُمْهُورُ إِنَّهُ يَجُوزُ)) [نیل الاوطار: ج ۸، ص ۲۰۱]

”شافعیہ، حنفیہ، زید بن علی، مؤید باللہ اور جمہور اس کے جواز کے قائل ہیں“

اہل حدیث علماء میں سے سید میاں نذیر حسین محدث دہلوی، نواب صدیق حسن خان اور حافظ عبداللہ محدث روپڑی رحمہم اللہ بھی اس کو جائز قرار دیتے ہیں۔

[فتاویٰ نذیریہ: ج ۲، ص ۱۶۲۔ الروضة النديه: ج ۲، ص ۸۹۔ فتاویٰ

اہل حدیث: ج ۲، ص ۲۶۳، ۲۶۴]

سعودی عرب کے سابق مفتی اعظم شیخ ابن باز رحمہم اللہ بھی اس کے جواز کے حامی

ہیں چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

”قسطوں کی بیع میں کوئی حرج نہیں جب کہ مدت اور قسطیں معلوم ہوں خواہ قسطوں

کی صورت میں قیمت نقد قیمت سے زیادہ ہو کیونکہ قسطوں کی صورت میں بائع اور

مشتري دونوں فائدہ اٹھاتے ہیں۔ بائع زیادہ قیمت سے اور مشتری مہلت سے

فائدہ اٹھاتا ہے۔“ [فتاویٰ اسلامیة: ج ۲، ص ۴۴۵]

اسلامی فقہ اکیڈمی جدہ نے بھی اپنے چھٹے اور ساتویں اجلاس میں جو بالترتیب سترہ تا تیس شعبان ۱۴۱۰ھ اور سات سے بارہ ذیقعدہ ۱۴۱۲ھ کو جدہ میں ہوئے، اس کو جائز قرار دیا ہے۔ چھٹے اجلاس کی قرارداد کے متعلقہ الفاظ یہ ہیں:

((تجوز الزيادة في الثمن المؤجل عن الثمن الحال كما يجوز

ذكر ثمن المبيع نقدا و ثمنه بالاقساط بمدة معلومة))

[موسوعة القضايا الفقهية المعاصرة و الاقتصاد الاسلامي

للدكتور علي احمد سالوس]

”ادھار میں نقد سے زیادہ قیمت جائز ہے۔ جس طرح چیز کی قیمت نقد اور متعینہ

اقساط میں ذکر کرنا جائز ہے۔“

ساتویں اجلاس کے الفاظ یوں ہیں:

((البيع بالتقسيط جائز شرعا ولو زاد فيه ثمن المؤجل على

المعجل)) [ايضا]

”بیع قسط شرعا جائز ہے خواہ اس میں ادھار قیمت نقد سے زیادہ ہو۔“

(۲) امام ابن حزم، امام ابن سیرین اور زین العابدین عدم جواز کے قائل ہیں۔

محدث البانی رحمۃ اللہ علیہ بھی اسی نقطہ نظر کے حامی ہیں۔

[سلسلة الاحاديث الصحيحة: ج ۵]

(۳) حضرات طاؤس، ثوری، اور اوزاعی کی رائے میں یہ ہے تو ناجائز لیکن اگر بائع اس

طرح سودا ہونے کے بعد دو قیمتوں میں سے کم یعنی نقد والی قیمت وصول کرے تو

جائز ورنہ ناجائز۔ [سلسلة الاحاديث الصحيحة: ج ۵]

قائلین جواز کے دلائل:

جو حضرات اس کے حق میں ہیں ان کا استدلال ایک تو اس بات سے ہے کہ

معاملات میں اصل اباحت ہے۔ یعنی کاروبار کی ہر وہ صورت جائز ہے جس سے شریعت

نے منع نہ کیا ہو۔ قرآن حکیم کی آیت: ﴿وَ أَحَلَّ اللَّهُ الْبَيْعَ﴾ ”اللہ تعالیٰ نے بیع کو حلال کیا ہے“ سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ سوائے ان بیوع کے جن کی حرمت قرآن و حدیث میں واضح کر دی گئی ہے، ہر قسم کی بیع جائز ہے، اور قرآن و حدیث میں کوئی ایسی نص موجود نہیں جس سے اس کی ممانعت ثابت ہوتی ہو۔ ان حضرات کی دوسری دلیل ذیل کا واقعہ ہے:

((عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَمَرَهُ أَنْ يُجَهَّزَ جَيْشًا فَانْفَدَتْ الْإِبِلُ فَأَمَرَهُ أَنْ يَأْخُذَ فِي قِلاَصِ الصَّدَقَةِ فَكَانَ يَأْخُذُ الْبَعِيرَ بِالْبَعِيرَيْنِ إِلَى إِبِلِ الصَّدَقَةِ)) [سنن ابی داؤد: کتاب البیوع : باب فی الرخصة فی ذلك]

”حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ان کو جیش تیار کرنے کا حکم دیا تو اونٹ کم پڑ گئے، اس پر آپ ﷺ نے فرمایا کہ صدقے کے اونٹ آنے تک ادھار لے لو۔ تو انہوں نے لوگوں سے اس شرط پر اونٹ لیے کہ جب صدقے کے اونٹ آئیں گے تو ایک کے بدلے دو دو دیئے جائیں گے۔“

مانعین کے دلائل:

جو حضرات اس کی ممانعت کے قائل ہیں ان کی پہلی دلیل یہ ہے:

✽ ادھار کی صورت میں اضافی رقم اصل میں مدت کا معاوضہ ہے اور مدت کا معاوضہ لینا سود ہے۔

✽ اس رائے کے حق میں دوسری دلیل وہ روایات ہیں جن میں ایک بیع میں دو بیعوں کی ممانعت بیان ہوئی ہے۔ مثلاً:

((نَهَى رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ بَيْعَتَيْنِ فِي بَيْعَةٍ))

[ترمذی: کتاب البیوع، باب ما جاء فی النهی عن بئعتین فی بیعة]

”رسول اللہ ﷺ نے ایک بیع میں دو بیعوں سے منع کیا ہے۔“



((نَهَى رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ صَفْقَتَيْنِ فِي صَفْقَةٍ

وَاحِدَةٍ)) [مسند احمد بن حنبل: ج ۸، ص ۳۸۳]

”رسول اللہ ﷺ نے ایک سودے میں دو سودوں سے منع کیا ہے۔“

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اس کی تشریح میں فرماتے ہیں کہ انسان یہ کہے:

((وان كان بنقد فبكذا وان كان بنسيئة فبكذا))

[مصنف ابن ابی شیبہ: ج ۵ ص ۵۴]

”اگر نقد ہو تو اتنے کی اور ادھار ہو تو اتنے کی۔“

رائح نقطہ نظر:

ہمارے خیال میں حسب ذیل وجوہ کے باعث ان لوگوں کی رائے زیادہ وزنی ہے جو جواز کے حق میں ہیں۔

✽ ادھار کی صورت میں اضافے کا جواز خود قرآن کی آیت ﴿وَ أَحَلَّ اللَّهُ الْبَيْعَ﴾ سے ثابت ہے۔ کیونکہ یہ آیت ان لوگوں کے رد میں نازل ہوئی ہے جیسا کہ ابن جریر طبری، علامہ ابن العربی، اور امام رازی رحمہم اللہ نے بیان کیا ہے۔ جن کا اعتراض یہ تھا کہ جب عقد بیع کے وقت ادھار کی زیادہ قیمت مقرر کی جاسکتی ہے تو پھر وقت پر ادائیگی نہ کرنے کی صورت میں اضافہ کیوں نہیں کیا جاسکتا۔ وہ کہتے دونوں صورتیں یکساں ہیں۔ چنانچہ رئیس المفسرین امام ابن جریر طبری رحمہم اللہ لکھتے ہیں:

((وذلك أن الدين كانوا يأكلون من الربا من أهل الجاهلية، كان

إذا حلّ مالٌ أحدهم على غريمه، يقول الغريم لغريم الحق زدني

في الأجل وأزيدك في مالك فكان يقال لهما إذا فعلا ذلك هذا

رباً لا يحل فإذا قيل لهما ذلك قالوا سواء علينا زدنا في أول البيع،

أو عند محلّ المال فكذبهم الله في قيلهم)) [تفسير طبری]

”اہل جاہلیت میں سے جو لوگ سود کھاتے تھے، اس کی صورت یہ ہوتی کہ جب کسی کا

دوسرے کے ذمے مال ہوتا جس کی ادائیگی کا وقت آچکا ہوتا وہ صاحبِ حق سے کہتا آپ مدت میں اضافہ کر دیں میں آپ کے مال میں اضافہ کرتا ہوں۔ جب ان سے کہا جاتا کہ یہ تو سود ہے جو حلال نہیں تو کہتے کہ ہم بیع کے آغاز میں اضافہ کریں یا مدت پوری ہونے پر، دونوں صورتیں یکساں ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان کی تردید فرمائی۔“  
مشہور محدث و مفسر علامہ ابن العربی رحمۃ اللہ علیہ رقمطراز ہیں:

((و كانت تقول انما البيع مثل الربا ای انما الزیادة عند حلول الاجل آخراً مثل اصل الثمن من اول العقد ورد الله عليهم قولهم)) [احکام القرآن]

”اہل جاہلیت کہتے تھے بیع سود کی مثل ہی ہے یعنی مدت پوری ہونے پر جو اضافہ کیا جاتا ہے وہ شروع عقد میں اصل قیمت میں اضافہ کی مانند ہے تو اللہ تعالیٰ نے ان کے اس قول کا رد فرمایا ہے۔“  
امام رازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

((القوم كانوا في تحليل الربا على هذه الشبهة وهي ان من اشترى ثوبا بعشرة ثم باع باحد عشر فهذا حلال فكذا اذا باع العشرة باحد عشر يجب ان يكون حلال لانه لا فرق في العقل بين الامرین فهذا في ربا النقد واما في ربا النسيئة فكذلك ايضا لانه لو باع الثوب الذي يساوي عشرة في الحال باحد عشر الى شهر جاز فكذا اذا اعطى العشرة باحد عشر الى شهر و يجب ان يجوز لانه لا فرق في العقل بين الصورتين)) [التفسير الكبير]

”ربا کو حلال قرار دینے کے متعلق لوگوں کا شبہ یہ تھا کہ جب کوئی شخص ایک کپڑا دس کا خرید کر گیارہ کا بیچے تو یہ جائز ہے اسی طرح جب دس (درہم) گیارہ کے بیچے تو معاملہ بھی جائز ہونا چاہیے۔ کیونکہ دونوں صورتوں میں عملاً کوئی فرق نہیں ہے یہ شبہ تو ربا النقد کے متعلق تھا۔“ ربا النسيئة کے بارہ میں یہ شبہ تھا کہ وہ کپڑا جس کی نقد

قیمت دس (درہم) ہے اگر وہ ایک مہینہ کے ادھار پر گیارہ کا بیچے تو یہ جائز ہے اسی طرح اگر دس (درہم) دے کر مہینے بعد گیارہ لے تو یہ بھی جائز ہونا چاہیے کیونکہ عقلی اعتبار سے دونوں میں کوئی فرق نہیں۔“

ان جلیل القدر ائمہ تفسیر کے بیان سے ثابت ہوا کہ اہل جاہلیت کی اصل غلطی یہ تھی کہ وہ وقت پر ادائیگی نہ کرنے کی صورت میں اصل دین پر اضافہ کو ادھار کی صورت میں زیادہ قیمت لینے پر قیاس کرتے تھے۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس کا رد کرتے ہوئے فرمایا، ادھار کی صورت میں قیمت میں اضافہ کرنا بیع میں شامل ہے جو جائز ہے جبکہ بروقت ادائیگی نہ کرنی کی صورت میں اضافہ سود ہے جو حرام ہے

✽ ہر مدت کا معاوضہ سود نہیں ہوتا۔ مہلت کا اضافہ تب سود بنتا ہے جب انسان کے ذمہ قرض یا دین (Debt) کی تاخیر یا اموال ربویہ کے تبادلے کی صورت میں ہو۔ نبی ﷺ نے سونے کے سونے کے ساتھ تبادلے میں دو شرطیں لگائیں ہیں:

۱۔ برابر برابر ہو۔

۲۔ دونوں جانب سے نقد ہو۔

اگر اسلام میں مدت کی قیمت کا اعتبار نہ ہوتا تو دونوں طرف سے نقد کی قید لگانے کی ضرورت نہ تھی۔ نیز ادھار کی صورت میں اضافہ بیع کے ضمن میں ہے اس لیے جائز ہے۔ فقہاء کرام نے بیع کے ضمن میں مدت کے اضافہ کو جائز قرار دیا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: ”المعاملات المالية المعاصرة: للدكتور وهبة زحيلي حفظه الله۔“

✽ یہ اضافہ ربا کی کسی قسم میں شامل نہیں۔ اس کا اقرار ان لوگوں کو بھی ہے جو اس کے مخالف ہیں۔ چنانچہ مفتی سیاح الدین کا کاخیل رضی اللہ عنہ لکھتے ہیں:

”ادھار کی وجہ سے جوٹمن میں اضافہ کیا جاتا ہے اس کو عین ربا اور ربا حقیقی کی طرح حرام نہیں کہا جاسکتا کیونکہ فقہاء کرام اور حضرات مفسرین نے حقیقی ربا کی جو تعریف کی ہے اس کے مطابق یہ ربا کی تعریف میں داخل نہیں ہے۔ [حکمت قرآن: جنوری

۱۹۹۲ء، ص ۱۴]

مزید لکھتے ہیں:

”سود سے اس کا فرق دو وجہوں سے ہے۔ ایک تو یہ دین پر اضافہ نہیں بلکہ شروع ہی سے ثمن مہنگا بتلا دینا ہے وہ اضافہ محض اس کے ذہن میں ہے نیز مدت کے بڑھنے کے ساتھ اس زیادتی میں اضافہ نہیں ہوتا۔“ [ماہنامہ حکمت قرآن: جنوری ۱۹۹۲ء، ص ۱۶]

✽ محدثین کرام اور فقہائے عظام نے ”بیعتین فی بیعة“ کے مختلف مفاہیم بیان کیے ہیں۔

✽ بائع یہ کہے کہ یہ کیڑا نقد دس کا اور ادھار بیس کا۔ مشتری کسی ایک قیمت کا تعین کیے بغیر خرید لے۔

✽ یہ کہا جائے کہ میں اپنا گھر تجھے اتنے میں بیچتا ہوں لیکن شرط یہ ہے کہ آپ نے اپنا غلام اتنے میں مجھے بیچنا ہے۔

✽ انسان کسی چیز کا سودا کرے مثلاً ایک قفیز گندم کا اور اس کی قیمت پیشگی ادا کر دے۔ گندم کی ادائیگی کے لیے ایک مہینہ مدت مقرر ہو جائے۔ جب مقررہ وقت آئے تو فروخت کنندہ کہے کہ وہ گندم آپ مجھے دو مہینے کی مدت کے لیے دو قفیز کے عوض فروخت کر دیں۔ [تحفة الاحوذی]

پہلی صورت کے ناجائز ہونے کی وجہ قیمت کا متعین نہ ہونا ہے۔ دوسری صورت میں بیع مستقبل کی شرط پر پینڈنگ ہے اور آخری دو صورتوں میں ربا لازم آتا ہے جبکہ بیع تقسیط ان سب سے مختلف ہے۔

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس سے بیع عینہ مراد ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

((وفی السنن عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم انه قال ((من باع بیعتین فی بیعة، فله او کسها او الربا)) و فیہ ایضا عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم انه قال اذا تبایعتم بالعینة و اتبعتم اذناہ

البقر و ترکتم الجهاد فی سبیل اللہ ارسل اللہ علیکم ذلاً لا یرفعہ عنکم حتی ترجعوا الی دینکم و هذا کله فی بیعة العینة و هو بیعتان فی بیعة)) [مجموع فتاوی: ج: ۲۹ ص ۴۳۲]

من باع بیعتین اور اذا تبایعتم بالعینة یہ سب بیع عینہ کے متعلق ہیں اور یہی ایک بیع میں دو بیعیں کرنے کا معنی ہے۔

بیع عینہ کا مطلب:

بیع عینہ یہ ہے کہ فروخت کنندہ کوئی چیز ادھار زائد قیمت پر بیچ کر نقد کم قیمت پر خرید لے۔ مثلاً ایک شخص نے دوسرے کو ایک سو دس روپے میں کتاب بیچی اور طے یہ ہوا کہ خریدار ایک مہینہ بعد ادائیگی کرے گا اگر فروخت کنندہ خریدار سے یہی چیز ایک سو روپے کے عوض نقد دوبارہ خرید لے تو یہ بیع عینہ ہوگی جو حرام ہے کیونکہ فروخت کنندہ نے دیا تو ایک سو روپیہ ہے مگر وصول ایک سو دس پانے ہیں یہی سود ہے چیز کا لین دین تو ایک حیلہ ہے۔

✽ مانعین کا حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما کی تشریح سے استدلال درست نہیں کیونکہ اس میں یہ احتمال بھی ہے کہ ان کی مراد یہ ہو کہ مشتری ایک قیمت طے کئے بغیر چیز اٹھا کر لے جائے احتمال کی صورت میں جمہور کی تشریح ہی معتبر ہوگی۔ جنہوں نے واضح الفاظ میں کہا ہے کہ اس کا معنی یہ ہے کہ مشتری نقد یا ادھار کی صراحت کیے بغیر چیز اٹھا کر لے جائے۔

ملاحظہ:

یہاں یہ بھی واضح رہے کہ یہ جواز صرف اس وقت ہے جب ادائیگی میں تاخیر پر اضافی رقم خواہ وہ جرمانہ کے نام پر ہو وصول نہ کی جائے۔

دونوں صورتوں میں فرق ہے۔ پہلی صورت میں جب چیز کی ایک قیمت طے ہو جاتی ہے پھر اس میں اضافہ ممکن نہیں ہوتا خواہ ادائیگی مدت مقررہ پر کی جائے یا تاخیر کر کے۔

دوسری صورت میں فریقین کے درمیان قیمت طے ہونے کے بعد تاخیر پر جرمانہ

وصول کیا جاتا ہے۔ جو زمانہ جاہلیت کے سود "اماتقضى و امان تربي" یا ادا کرو یا اضافہ کرو میں داخل ہے جو سراسر ناجائز ہے۔

ہمارے ہاں چونکہ قسطوں کی خرید و فروخت میں عموماً تاخیر پر جرمانہ عائد کیا جاتا ہے لہذا اس کو مطلق جائز قرار دینا درست نہیں ہے۔

### خلاصہ

- ❁ کریڈٹ اور چارج کارڈز سودی ہیں لہذا ان کا استعمال حرام ہے۔
- ❁ ڈیبٹ کارڈ کے استعمال میں کوئی حرج نہیں۔
- ❁ کمرشل انشورنس کی تمام قسمیں ناجائز ہیں۔
- ❁ روایتی بینکوں میں رائج لیزنگ سودی معاملہ ہے۔
- ❁ سٹاک مارکیٹ میں شیئرز کا لین دین درست ہے مگر فیوچر سیل، سٹاک سیل اور بدلہ جائز نہیں۔
- ❁ لین دین میں ہنڈی، پرامیسری نوٹ اور چیک کے استعمال میں شرعاً کوئی خرابی نہیں سوائے ان مواقع کے جہاں دونوں یا ایک جانب سے نقد ہونا شرط ہے۔
- ❁ بینک کے ذریعے ان کی وصولی اور اس پر معاوضہ دینا بھی جائز ہے۔
- ❁ جلد وصولی کی غرض سے بٹہ لگوانا سود میں شامل ہیں۔
- ❁ پگڑی اجارہ قوانین کے خلاف ہے لہذا یہ درست نہیں۔
- ❁ ادھار میں نقد سے زیادہ قیمت لگائی جاسکتی ہے۔
- ❁ اکثر محدثین عظام نے ایک بیع میں دو بیع کی جو تشریح کی ہے بیع قسط اس میں شامل نہیں۔
- ❁ ادائیگی میں تاخیر پر جرمانہ عائد کرنا سود ہے۔



## اسلامی بینکاری کی حقیقت!

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ روایتی بینکاری کا مکمل نظام خلاف شریعت اور غیر فلاحی ہے۔ مگر دوسری طرف یہ بھی امر واقع ہے کہ آج کے دور میں قومی اور بین الاقوامی سطح پر تجارت اور لین دین میں بینک کا عمل دخل اس قدر بڑھ چکا ہے کہ اب اس سے پہلو بچانا ممکن نہیں رہا۔ اندریں حالات اسلامی اقتصادی ماہرین کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں اس کا قابل عمل اور شافی حل تلاش کریں اور ایسا بینکاری سسٹم متعارف کرائیں جو اسلامی اصولوں کے مطابق ہو۔

اس ضرورت کے پیش نظر بعض حضرات نے اسلامی بنکاری کے نام سے ایک متبادل پیش کیا ہے یقیناً ان حضرات نے اس میدان میں اپنی بہترین توانائیاں صرف کی ہیں مگر بد قسمتی سے ان کی طرف سے متعارف کرایا گیا متبادل اسلام کے مثالی اقتصادی نظام ”نفع و نقصان میں شراکت“ پر مبنی نہیں ہے اس وجہ سے علمی حلقوں میں ہدف تنقید بنا ہوا ہے۔ لہذا ضرورت اس امر کی ہے کہ شرعی قواعد و ضوابط کی روشنی میں رائج الوقت اسلامی بینکاری کا بے لاگ تجزیہ کر کے دیکھا جائے کہ یہ شریعت سے ہم آہنگ ہے یا نہیں؟

اسلامی بینکاری کا مطلب:

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مروجہ اسلامی بینکاری کی شرعی حیثیت پر گفتگو کرنے سے قبل اسلامی اقتصادی ماہرین کے حوالے سے اسلامی بینکاری کا صحیح مفہوم اور موجودہ اسلامی بینکاری کا مختصر خاکہ بیان کر دیا جائے تاکہ اسکی روشنی میں اسلامی بینکوں کے معاملات کو سمجھنے میں آسانی رہے۔

بلاشبہ اسلامی بینکاری کی اولین شرط یہی ہے کہ وہ سود سے پاک ہو لیکن اسلامی

بینک کہلانے کے لیے محض غیر سودی ہونا کافی نہیں بلکہ معاملات سے متعلق دیگر احکام شرعیہ کی پابندی بھی ضروری ہے۔ چنانچہ ماہرین اسلامی بینکاری کی تعریف یوں کرتے ہیں۔

(المصرف الاسلامی هو: مؤسسة مالية مصرفية تزاوّل أعمالها وفق أحكام الشريعة الإسلامية) [المصارف الإسلامية بین

النظرية و التطبيق: ص ۱۷۴ للدكتور عبدالرزاق رحيم جدی]

”اسلامی بینک سے مراد بینکنگ سے متعلق ایسا مالیاتی ادارہ ہے جو اپنے معاملات شرعی احکام کے مطابق انجام دے۔“

ڈاکٹر رفیق یونس مصری اسلامی بینکاری پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

(أن المصرف لا يصير إسلامياً تماماً إذا كف عن المحرمات فحسب، بل لا بد أيضاً لكي يكون إسلامياً تماماً من أن تكون عقوده مصممة وفق أحكام الشريعة من حيث شروطها وأركانها وخياراتها..... والخلاصة فإن المصرف الإسلامي ليس هو المصرف الذي ينتهي عن الربا وسائر المحرمات، بل هو المصرف الذي يعمل بالأوامر إضافة إلى تركه النواهي) [المصارف الإسلامية ص: ۸]

”بینک فقط حرام امور کے عدم ارتکاب سے مکمل اسلامی نہیں بن جاتا بلکہ اس کے مکمل اسلامی بننے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اس کے معاملات اپنی شرائط، ارکان اور اختیارات کے لحاظ سے بھی شریعت کے احکام کے موافق ہوں..... خلاصہ کلام یہ کہ اسلامی بینک وہ نہیں ہے جو صرف سود اور حرام امور سے اجتناب کرے بلکہ اسلامی بینک وہ ہے جو ممنوعہ امور کے ساتھ شرعی احکام کی بھی پابندی کرے۔“

اسلامی بینکاری کی مندرجہ بالا تعریف سے یہ حقیقت روز روشن کی طرح واضح ہے کہ صرف سود نکال دینے سے بینکاری سٹم اسلامی نہیں بن جاتا تا وقتیکہ بینک کے تمام



معاملات ہر پہلو سے شرعی احکام کے مطابق نہ ہو جائیں۔ یعنی غرر (Uncertainty) سے پاک ہوں، ایک عقد (Contract) میں دو معاملے یا دو شرطیں جمع نہ ہوں، ایسی شرط پر مشتمل نہ ہوں جو طے شدہ معاملے کے تقاضوں کے خلاف ہو یا ایسی چیز فروخت نہ کی جائے جو عقد بیع کے وقت بینک کے پاس موجود ہی نہ ہو وغیرہ۔

مروجہ اسلامی بینک اس تعریف پر کس حد تک پورا اترتے ہیں اس کا فیصلہ آئندہ صفحات کے مطالعہ سے باسانی کیا جاسکتا ہے۔

### اسلامی بینکاری کی تاریخ ابتدا:

بعض حضرات کے خیال میں موجودہ اسلامی بینکاری کا نقطہ آغاز مصر کا مت غمر نامی پراجیکٹ ہے جس نے 1963ء سے 1967ء تک تقریباً چار سال مت غمر نامی قصبے میں کام کیا۔

اس طرح ملائیشیا میں ایک ادارہ ”حجاج کا انتظامی فنڈ اور بورڈ“ کے نام سے 1969 میں قائم ہوا تھا جو تبونگ حاجی کے نام سے مشہور ہے اس ادارے کو بھی اسلامی بینکاری کے ابتدائی تجربات میں شمار کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ درست نہیں کیونکہ یہ دونوں ادارے معروف معنوں میں بینک نہیں تھے بلکہ یہ انتہائی محدود مقاصد کے لیے قائم کیے گئے تھے۔ مت غمر پراجیکٹ کا دائرہ عمل دیہی کاشتکاروں جبکہ تبونگ حاجی کے پیش نظر حجاج کو مالیات کی سہولت فراہم کرنا تھا۔ ظاہر ہے یہ مکمل بینکاری نہیں۔

بعض محققین مصر کے ناصر سوشل بینک (قیام 1971ء) کو پہلا باضابطہ اسلامی بینک قرار دیتے ہیں لیکن اسلامی بینکاری کے جدید ماہرین اس کو تسلیم نہیں کرتے ان کی رائے میں مکمل اسلامی بینکاری کا باقاعدہ آغاز 1975ء میں دہلی اسلامی بینک سے ہوا۔

دہلی اسلامی بینک کے بعد جس ادارے نے اس میدان میں نمایاں کردار ادا کیا وہ کویت فنانس ہاؤس (بيت التمويل الكويتي) کے نام سے 1977ء میں وجود میں آیا۔

اس کے بعد بھی مختلف ادوار میں مختلف اسلامی بینکوں کا قیام عمل میں آتا رہا ہے۔

اسلامی بینکاری کی ترقی و فروغ:

لیکن اسلامی بینکاری کو غیر معمولی ترقی اور فروغ 2002 کے بعد حاصل ہوا ہے۔ اس وقت دنیا کے تقریباً 75 ممالک میں اسلامی بینک کام کر رہے ہیں ان میں بعض غیر مسلم ممالک بھی شامل ہیں۔ صرف پاکستان میں مختلف بینکوں کی پانچ سو سے زائد برانچوں میں اسلامی بینکاری کے نام پر کام ہو رہا ہے۔ ان میں سے بعض بینک تو مکمل طور پر اسلامی بینک کہلاتے ہیں جیسے میزان بینک، البرکہ بینک، بینک اسلامی پاکستان اور دبئی اسلامی بینک وغیرہ جبکہ بعض بنیادی طور پر تو سودی ہیں مگر ان میں اسلامی بینکاری کا شعبہ بھی قائم ہے۔ اسلامی بینکاری کے حامی یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ نظام نہ صرف کامیابی سے چل رہا ہے بلکہ تیز رفتاری سے ترقی کی منازل بھی طے کر رہا ہے۔ سرمایہ کاروں کی بڑی تعداد اس جانب راغب ہو رہی ہے۔ اور عام لوگوں کا اعتماد بھی بڑھ رہا ہے۔

اسلامی بینکوں کے معاملات کا اجمالی تذکرہ:

اسلامی بینکوں کے معاملات کو چار حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ سرمایہ حاصل کرنے کے ذرائع۔

۲۔ سرمایہ فراہم کرنے (Financing) کے طریقے۔

۳۔ براہ راست سرمایہ کاری کی شکلیں۔

۴۔ بینکاری خدمات۔

سرمایہ حاصل کرنے کے ذرائع:

اسلامی بینکوں میں سرمایہ حاصل کرنے کے دو طریقے ہیں۔

۱۔ قرض

۲۔ مضاربہ

کیونکہ عام بینکوں کی طرح اسلامی بینکوں میں بھی دو قسم کے ہی کھاتے کھولے جاتے ہیں۔

(i) جاری کھاتے (Current Accounts)

(ii) سرمایہ کاری کھاتے۔

جاری کھاتوں میں جمع رقوم بینک کے ذمے قرض ہوتی ہیں۔ روایتی بینکوں کی طرح اسلامی بینک بھی ان کھاتوں پر کوئی منافع نہیں دیتے۔ ان کھاتوں کا وہی حکم ہے جو عام بینکوں کے جاری کھاتوں کا ہے۔ جبکہ سرمایہ کاری کھاتوں کی مختلف صورتیں ہیں مگر بنیاد تقریباً سب کی مضاربت ہی ہے۔

سرمایہ فراہم کرنے کے طریقے:

✽ مُرَابَحَہ۔

✽ اِجَارَہ۔

✽ مِشَارَكَہ مِثْلَاقِصَہ۔

✽ تَوْرُق۔

✽ سَلَم۔

✽ اِسْتِصْنَاع۔

قرضِ حسنہ سے بینک کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا اس لیے اسلامی بینک قرضِ حسنہ جاری نہیں کرتے۔

شرکت و مضاربت میں نقصان کا بھی اندیشہ ہوتا ہے لہذا اسلامی بینک شرکت و مضاربت کی بنیاد پر بھی سرمایہ فراہم نہیں کرتے۔ چنانچہ مروجہ اسلامی بینکوں کے ایک ترجمان صاحب لکھتے ہیں۔

”عام طور پر اسلامی بینک ڈیپازٹ سائیڈ پر تو مشارکہ و مضاربت اختیار کرتے ہیں لیکن عام طور بعض مجبوریوں کی وجہ سے کلائنٹ کو مشارکہ و مضاربت کی بنیاد پر سرمایہ

فراہم نہیں کیا جاتا بلکہ اکثر مراہجہ، اجارہ، سلم یا ہوم مشارکہ وغیرہ کے ذریعے فنانس دی جاتی ہے۔ [اسلامی بینکاری اور غرض 12]

البتہ برآمد میں بعض دفعہ مشارکہ بھی کر لیا جاتا ہے کیونکہ برآمد میں بینک کو نقصان کا خاص خطرہ نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ برآمد کنندہ کے پاس پہلے سے متعین آرڈر موجود ہوتا ہے قیمت بھی طے ہوتی ہے، لاگت کا بھی اندازہ ہوتا ہے نیز ایل سی کی وجہ سے ادائیگی بھی یقینی بلکہ خود بینک کے ذریعے ہوتی ہے اس وجہ سے کچھ اسلامی بینکوں میں بعض برآمد کنندگان کو مشارکہ کے ذریعے بھی فنانس دی جاتی ہے۔ تاہم موجودہ اسلامی بینکاری کی ترویج و ترقی میں دوسرے طریقوں کی نسبت اس کا حصہ بہت کم ہے۔

براہ راست سرمایہ کاری کی شکلیں:

- ✽ مختلف کمپنیوں کے حصص کی خرید و فروخت، سکوک کا اجراء اور لین دین۔
- ✽ اہم نوعیت کے منصوبوں پر سرمایہ کاری کرنا۔
- ✽ ذیلی کمپنیاں جیسے تکافل کمپنی قائم کر کے کاروبار کرنا۔
- ✽ مختلف کرنسیوں کی خرید و فروخت۔

بینکاری خدمات:

- ✽ گارنٹی لیٹرز کا اجراء۔
- ✽ ایل سی کھولنا۔
- ✽ ڈرافٹ۔
- ✽ ایجنسی فیس کے عوض ہنڈیوں کی وصولی۔
- ✽ اور لاکرز کی سہولت مہیا کرنا۔

اسلامی بینکوں کا پیش کردہ متبادل مثالی نہیں:

یہاں اس حقیقت کا اظہار بھی ضروری ہے کہ شرعی اعتبار سے ”مراہجہ“ خرید

وفروخت کا ایک طریقہ اور ”اجارہ“ کسی چیز کا حق استعمال حاصل کرنے کا ایک معاہدہ تو ہے لیکن یہ فائنانسنگ کے طریقے قطعاً نہیں ہیں اس لیے ”مراہجہ“ اور ”اجارہ“ کی اساس پر فائنانسنگ نہ تو شریعت کو مطلوب ہے اور نہ ہی تقسیم دولت کے حوالے سے سود مند ہے۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ اسلامی بینکوں کے حامی بھی یہ اعتراف کرتے ہیں کہ مراہجہ اور اجارہ پسندیدہ متبادل نہیں۔ چنانچہ مفتی تقی عثمانی صاحب لکھتے ہیں۔

”مراہجہ اور اجارہ (لیزنگ) والے فائنانسنگ کے طریقوں پر عموماً یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ ان کا آخری نتیجہ سودی قرضے سے مختلف نہیں ہوتا، یہ اعتراض ایک حد تک درست بھی ہے، یہی وجہ ہے کہ اسلامی بینکوں اور مالیاتی اداروں کے شریعہ ایڈوائزری بورڈز اس نکتے پر متفق ہے کہ یہ فائنانسنگ کے مثالی طریقے نہیں ہیں اس لیے انہیں صرف ضرورت کے موقع پر ہی استعمال کرنا چاہیے اور وہ بھی شریعت کی طرف سے مقرر کردہ شرائط کا پورا پورا ادھیان رکھتے ہوئے۔“ [اسلامی بینکاری کی بنیادیں ص 19]

دوسری جگہ فرماتے ہیں۔

”یہ مراہجہ اور لیزنگ (Leasing) مطلوبہ اور پسندیدہ متبادل (Ideal Alternative) نہیں ہیں اور اس سے تقسیم دولت (Distribution Of Wealth) پر کوئی بنیادی اثر نہیں پڑتا۔“ [ج 7 ص 169]

چونکہ یہ متبادل غیر مثالی، غیر فلاحی اور نتائج کے اعتبار سے سودی نظام کے مماثل ہے اس لیے اسلامی نظریاتی کونسل نے جب یہ تجویز کیا تھا تو اس کو بڑے پیمانے پر اور غیر معینہ مدت کے لیے استعمال کرنے کی مخالفت کی تھی بلکہ کونسل کی رائے یہ تھی

”یہ خطرہ بھی موجود ہے کہ یہ طریقے بالآخر سودی لین دین اور اس سے متعلقہ برائیوں کے از سر نو رواج کے لیے چوردروازے کے طور پر استعمال ہونے لگیں۔ لہذا یہ امر ضروری ہے ان طریقوں کا استعمال کم سے کم حد تک صرف ان صورتوں اور

خاص حالات میں کیا جائے جہاں یہ ناگزیر ہوں اور اس بات کی ہرگز اجازت نہ دی جائے کہ یہ طریقے سرمایہ کاری کے عام معمول کی حیثیت اختیار کر لیں۔“

[رپورٹ بلا سود بینکاری ص: 13]

یاد رہے کونسل کی یہ رپورٹ جدید اسلامی بینکاری کیلئے نچست اول شمار ہوتی ہے اس رپورٹ میں صاف کہا گیا ہے کہ یہ متبادل ناسازگار ماحول کے لیے ہے۔ سودی لین دین کا مثالی نعم البدل نفع و نقصان میں شراکت یا قرض حسنہ کی بنیاد پر سرمایہ کی فراہمی ہے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کو وسعت دی جائے اور تمام دوسرے متبادل طریقے ختم کر دیئے جائیں۔ مگر افسوس اسلامی بینکوں میں اس جانب خاطر خواہ پیش رفت نہیں ہو رہی بلکہ غیر پسندیدہ طریقوں کو ہی اصل سمجھ لیا گیا ہے۔

اسلامی بینکوں کا عذر:

مروجہ اسلامی بینک نفع و نقصان میں شراکت کی بنیاد پر سرمایہ فراہم نہ کرنے کا یہ عذر پیش کرتے ہیں کہ آج کل معاشرے میں بددیانتی عام ہے جو شخص اس اصول پر بینک سے رقم لے گا وہ ہمیشہ نقصان ہی ظاہر کرے گا یوں بینک بھی خسارے میں رہے گا اور اس کے ذریعے ڈپازیٹر کو بھی نقصان پہنچے گا۔

بلاشبہ شرکت و مضاربت میں یہ عملی مشکل ہے لیکن اسے بہانہ بنا کر غیر پسندیدہ متبادل پر قانع ہو کر بیٹھ جانا اور اس کو شریعت کے عین مطابق قرار دینا بھی قابل ستائش رویہ نہیں ہے کیونکہ یہ ایسی مشکل بھی نہیں جس کا حل نہ نکالا جاسکے۔ سودی بینکوں کے نادہندگان بھی ناقابل وصول قرضوں کی مشکلات پیدا کرتے رہتے ہیں مگر وہ قرضے دینا بند نہیں کرتے بلکہ احتیاطی تدابیر اختیار کر کے اس کے امکانات کم کرتے ہیں۔ شرکت و مضاربت میں بھی احتیاطی تدابیر، اکاؤنٹس اور آڈٹ کے شفاف نظام سے اس پر باآسانی قابو پایا جاسکتا ہے۔ نیز یہ قانون بھی اس برائی کے سدباب میں مدد و معاون ثابت ہو سکتا

ہے کہ جو شخص یا ادارہ ایک مرتبہ بددیانتی کا مرتکب پایا گیا آئندہ کوئی بینک اسے سرمایہ نہیں دے گا۔ اگر موثر طریقے سے اس نظام کو آگے بڑھایا جائے تو اس کے حوصلہ افزاء نتائج سامنے آسکتے ہیں۔

جائٹ اسٹاک کمپنیوں کی مثال ہمارے سامنے ہے بددیانتی کے باوجود وہ اپنی بیلنس شیٹ میں نفع ظاہر کرتی ہیں۔ خود اسلامی بینک کھاتہ داروں سے مضاربت کی بنیاد پر سرمایہ حاصل کرتے ہیں مگر آڈٹ اور سنٹرل بینک کی نگرانی کی وجہ سے کھاتہ داروں کی رقم نہ صرف محفوظ ہوتی ہیں بلکہ منافع بھی ملتا ہے۔

مروجہ اسلامی بینکاری علماء کی نظر میں:

اس میں دوسری رائے نہیں کہ اسلامی مالیاتی نظام کا نفاذ دینی طبقہ کی دیرینہ خواہش ہے مگر اسلام کے نام پر جس قسم کی بینکاری متعارف کرائی گئی ہے علماء اس پر مطمئن نہیں ہیں۔ گنتی کے چند علماء کو چھوڑ کر باقی علماء اسے مسترد کر چکے ہیں۔ ان کی رائے میں یہ بھی سودی نظام ہی ہے کیونکہ عملاً دونوں میں کوئی فرق نہیں سوائے اسکے کہ اسلامی بینک شرعی اصطلاحات مراہجہ، اجارہ اور مشارکہ وغیرہ استعمال کرتے ہیں۔ چنانچہ ملک کے معروف علماء کا فتویٰ ہے:

”اسلام کی طرف منسوب مروجہ بینکاری قطعی غیر شرعی اور غیر اسلامی ہے لہذا ان بینکوں کے ساتھ اسلامی یا شرعی سمجھ کر جو معاملات کئے جاتے ہیں وہ ناجائز اور حرام ہیں اور ان کا حکم دیگر سودی بینکوں کی طرح ہے۔“ [ ماہنامہ ”بینات“ کراچی ص 182 اکتوبر 2008ء ]

بلکہ بعض حلقے تو اسلامی بینکاری کو تشویش کی نظروں سے بھی دیکھ رہے ہیں ان کے خیال میں اسلامی بینکاری ایک سازش ہے جس کا مقصد ان لوگوں کی دولت سے فائدہ اٹھانا ہے جو سود سے نفرت کرتے ہیں اور وہ اپنے اس عقیدہ کی بنیاد پر روایتی بینکوں کے ساتھ کوئی معاملہ کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

موجودہ اسلامی بینکوں پر تنقید کی وجوہ:

ہماری رائے میں مروجہ اسلامی بینکوں پر ہونے والی تنقید کے پیچھے یہ سوچ ہرگز کار فرما نہیں کہ ہماری معیشت کے لیے سود ناگزیر ہے یا اس جدید دور میں شرعی احکام قابل عمل نہیں رہے ”نعوذ باللہ من ذلك“ بلکہ اس کی ایک وجہ تو وہی ہے جو اوپر ذکر ہوئی ہے کہ بنیادی طور پر ”مراہجہ اور اجارہ“ فائنانسنگ کے طریقے نہیں ہیں اور نہ ہی تقسیم دولت پر ان کے اچھے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

اس کی دوسری وجہ اسلامی بینکوں کا طریقہ کار ہے جس پر اسلامی کی بجائے روایتی بینکاری کی چھاپ غالب ہے۔ ذیل میں تفصیل ملاحظہ فرمائیں۔

اسلامی بینکوں میں رائج اجارہ کا مقصد فائنانسنگ ہے نہ کہ حقیقی اجارہ:

اسلامی بینکوں میں رائج اجارہ، مشارکہ متناقصہ سے بینک کی اصل غرض ذاتی ضرورت یا تجارتی اور پیداواری مقاصد کے لیے افراد یا اداروں کو سرمایہ مہیا کر کے فائدہ اٹھانا ہوتا ہے۔ حقیقی اجارہ یا شراکت کا ارادہ نہیں ہوتا۔ جہاں صرف سرمایہ فراہم کر کے فائدہ حاصل کرنا مقصود ہو حقیقی اجارہ اور شراکت کا ارادہ نہ ہو وہ معاملہ رقم پر منافع لینے کے ہی مترادف ہوگا۔ کیونکہ معاملات میں مقصد کو دیکھا جاتا ہے نہ کہ الفاظ کو۔ چنانچہ نبی ﷺ کا فرمان ہے:

((إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ ، وَإِنَّمَا لِكُلِّ امْرِئٍ مَّا نَوَى))

[صحیح بخاری: باب کیف كان بدء الوحي]

”اعمال نیتوں پر موقوف ہیں اور ہر شخص کے لیے وہی ہوگا جس کی اس نے نیت کی۔“

قانونِ اسلامی کا معروف قاعدہ ہے:

((العبرة في العقود للمقاصد والمعاني لا للالفاظ))

”معاملات میں مقاصد و معانی کا خیال رکھا جاتا ہے نہ کہ الفاظ کا۔“



عظیم محدث امام ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

((فعلم ان الاعتبار في العقود والافعال بحقائقها ومقاصدھا دون ظواهر الفاظها وفعالها)) [اعلام الموقعین: ج ۳، ص: ۲۸۰]  
 ”معلوم ہوا کہ معاملات اور افعال میں اصل اعتبار ان کے حقائق اور مقاصد کا ہے۔ ظاہری الفاظ اور افعال کا نہیں۔“

اسلامی بینکاری کے معروف سکالر ڈاکٹر رفیق یونس مصری لکھتے ہیں:

((لو ان هذين الاثنين اللذين اشتركا في ملكية العقار اتفقا منذ الاشتراك في العقار على ان يسددا احدهما اقساطا محددة، يصبح مالكا بعدها للعقار كله، سواء كان خلال المدة مستاجرا لحصصة شريكه او غير مستاجر لها، فان هذا بنظري غير جائز و كذلك لو اتفقا قبل الدخول في شركة العقار ان يبيع احدهما للاخر حصته ببيع تقسيط فهذا غير جائز لان بيع التقسيط غير جائز بل لانه شاركة على ان يبيعه فعرف ان المراد ليس هو الشركة ولا البيع ولا الايجار انما المراد هو التمويل، ودخول البيع والايجار عليه انما الغرض هو الوصول الى فائدة من وراء هذا التمويل))

[المصارف الاسلاميه: ص ۴۱]

”اگر یہ دونوں جو ریٹیل پراپرٹی کی ملکیت میں شراکت دار ہیں شروع ہی سے اس بات پر اتفاق کر لیں کہ ان میں سے ایک متعینہ اقساط ادا کر کے مکمل پراپرٹی کا مالک بن جائے گا خواہ دوران مدت شریک کے حصے کا کرایہ ادا کرے یا نہ کرے، تو میری نظر میں یہ معاملہ جائز نہیں۔ اسی طرح اگر یہ دونوں ریٹیل پراپرٹی کی شراکت میں داخل ہونے سے پہلے اس پر متفق ہو جائیں کہ ان میں سے ایک اپنا حصہ قسطوں میں دوسرے کو بیچ دے گا یہ بھی جائز نہیں اس لیے نہیں کہ بیچ قسط نا جائز ہے بلکہ اس

لیے کہ اس نے اس شرط پر شراکت داری کی ہے کہ وہ اپنا حصہ اسے فروخت کر دے گا تو اس سے معلوم ہوا کہ حقیقی شراکت، بیع اور اجارہ مقصود نہیں بلکہ مقصود فنانسنگ ہے بیع اور اجارہ کو اس پر داخل کرنے کی غرض فنانسنگ کے پردے میں فائدہ حاصل کرنا ہے۔“

حاصل کلام یہ کہ معاملات میں ظاہری الفاظ کو خاص اہمیت نہیں دی جاتی بلکہ مقصد کو دیکھا جاتا ہے اس اصول کے مطابق اسلامی بینکوں میں رائج اجارہ اور مشارکہ متناقصہ ناجائز ہیں کیونکہ بینک کا مقصد حقیقی اجارہ یا مشارکہ کی بجائے مالیاتی ثالثی کے ذریعے فائدہ اٹھانا ہوتا ہے۔ اس میں اور سود پر رقم کے لین دین میں کوئی فرق نہیں ہے۔ شرح سود کو معیار بنانا:

اسلامی بینک مراہجہ اور اجارہ وغیرہ کو جو اپنی اصل کے اعتبار سے طریقہ ہائے تمویل (Modes of Financing) نہیں ہیں کو تمویلی سرگرمیوں کے لیے استعمال کرتے وقت اپنے نفع کا تعین شرح سود کے مطابق کرتے ہیں۔ چنانچہ مروجہ اسلامی بینکاری کے ایک سرگرم حامی لکھتے ہیں۔

”چوتھا مسئلہ یہ ہے کہ موجودہ حالات میں اسلامی بینک عام طور پر مروجہ بینکوں کے باہمی شرح سود کو معیار (Bench Mark) کے طور پر استعمال کر کے اپنے نفع یا کرایہ کا تعین کرتے ہیں جیسے پاکستان میں کابور (Karachi inter bank offered: Kibor rate) وہ شرح جس پر کراچی کے بینک ایک دوسرے سے لین دین کرتے ہیں۔) کو معیار بنایا جاتا ہے اس پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ ایسا کرنا جائز نہیں۔ [اسلامی بینکاری، ایک حقیقت پسندانہ جائزہ: ص 52]

موصوف نے اس کو جواز بخشنے کے لیے جو تاویل کی ہے اس پر وہ خود بھی مطمئن نہیں یہی وجہ ہے کہ ایک صفحہ بعد ہی ”متبادل کی تلاش بھی کرنی چاہیے“ کا عنوان قائم کر دیا ہے۔ دوسری جگہ مراہجہ میں نفع کو کابور کے ساتھ مربوط کرنے کے حوالے سے لکھتے ہیں:

”اس صورت میں اس اعتبار سے تو عقد درست ہو جاتا ہے کہ بیچی گئی چیز کی قیمت متعین ہو جاتی ہے لیکن اس اعتبار سے اس میں ناپسندیدگی کا عنصر شامل ہو جاتا ہے کہ اس میں ایک شرح سود کو بطور بیچ مارک استعمال کیا گیا ہے۔ اس لیے اسلامی بینکوں کو چاہیے کہ کوئی اسلامی بیچ مارک تشکیل دیں تاکہ اس ناپسندیدگی کے عنصر کا بھی خاتمہ ہو سکے۔“ [اسلامی بینکاری اور غرر: ص 56]

مولانا مفتی تقی عثمانی صاحب جو متعدد اسلامی بینکوں کی شرعی رہنمائی کا فرض سرانجام دے رہے ہیں روزنامہ امت کو انٹرویو دیتے ہوئے ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں:

”مثالی نظام مشارکہ اور مضار بہ معاشی انصاف فراہم کر سکتا ہے وہ وقت ابھی دور ہے کیونکہ مشارکہ اور مضار بہ کا استعمال Assests سائڈ پر بہت کم ہوتا ہے اور استعمال کم ہوئے پھر ان کی بنیاد پر Investment کم ہے لہذا اس کی جگہ ثانوی نوعیت کی پراڈکٹ اجارہ، مراہجہ، Diminishing Musharaika وغیرہ استعمال کرتے ہیں۔ ان میں مشکل یہ ہے کہ Bench mark وہی رہتا ہے جو سودی نظام میں ہے۔ اس کے معانی یہ ہیں کہ آپ کو روپیہ ادھار دینے کی بجائے کتاب بیچ دی کہ چھ مہینے بعد دینا۔ کتاب بیچی لیکن نفع Fix کر دیا اور ایک مخصوص مدت بعد وصولی کا معاہدہ کر لیا۔ اس منافع کمانے کا بیچ مارک وہی ہے جو سودی نظام کا ہے اس لیے اسلامی نظام کے معاشرے پر جو اثرات ہونے چاہیے تھے وہ ابھی تک نہیں ہو رہے۔“ [روزنامہ امت: 4 دسمبر 2005ء ص 5، 7]

حضرت مفتی صاحب بجا فرماتے ہیں کہ اجارہ، مراہجہ ثانوی نوعیت کے پراڈکٹ ہیں اور معاشرے پر ان کے وہ اثرات بھی مرتب نہیں ہو رہے جو اسلامی نظام کے ہونے چاہیں۔ تو کیا ہم یہ پوچھنے کی جسارت کر سکتے ہیں کہ پھر اس کو وقت کی ضرورت قرار دے کر فتوؤں کے ذریعے اسلامی ثابت کرنے کی کوشش کیوں کی جا رہی ہے؟

اسلامی بینکوں کا طریقہ بھی سودی بینکوں جیسا ہے:

✽ سودی بینکوں کا طریقہ ہے کہ وہ مقررہ مدت کے لیے رقم دیتے ہیں اور اس پر زائد

منافع (انٹرسٹ) کے نام سے وصول کرتے ہیں اس کو سود کہتے ہیں۔ اسلامی بینک بھی براہ راست چیز خریدنے کی بجائے کلائنٹ کو ہی کہتے ہیں کہ وہ اپنی مطلوبہ چیز خود خرید لے پھر مقررہ مدت تک بینک کو منافع کے ساتھ اقساط ادا کرتا رہے۔ اس کو ایجنسی ایگریمنٹ کا نام دیا جاتا ہے یعنی یہ کہا جاتا ہے کہ بینک نے کلائنٹ کو خریداری کیلئے اپنا وکیل بنا دیا ہے۔ یہ تکنیک سودی قرض کے ہی مشابہ ہے یہی وجہ ہے کہ اسلامی بینکاری کے حامی بھی اس کو جائز نہیں سمجھتے۔ [ملاحظہ فرمائیے: المعاییر الشرعیہ ص 112 اور اسلامی بینکاری کی بنیادیں ص 164]

سودی بینک کھاتہ داروں کو متعین منافع دیتے ہیں جو سود کے زمرہ میں آتا ہے۔ اسلامی بینک بھی یہی تاثر دیتے ہیں ثبوت کے لیے دیکھیے روزنامہ نوائے وقت 30 جولائی 2008 صفحہ 2 پر ایمیرٹس اسلامی بینک اور الفلاح اسلامی بینک کی طرف سے دیا گیا الگ الگ اشتہار۔ ایمیرٹس اسلامی بینک نے اپنے اشتہار میں 11.75 فیصد سالانہ منافع کا لالچ دیا ہے البتہ سٹار لگا کر ایک جانب باریک سا لکھ دیا ہے:

”پانچ سالہ ڈپازٹس پر گذشتہ ماہ کا اعلان کردہ منافع۔“

جبکہ الفلاح اسلامی بینک نے تین سالہ ٹرم ڈپازٹ پر 10.1 فیصد ”حلال منافع“ دینے کا وعدہ کیا ہے اور سٹار لگا کر باریک سا یہ لکھ دیا ہے:

”یہ مذکورہ منافع جون 2008ء میں دیا گیا آئندہ مختلف ہو سکتا ہے۔“

یہ سٹارنگ بھی دراصل مخالفین کو چپ کروانے کے لیے ہے۔ ورنہ حقیقت میں سودی بینکوں کی طرح پہلے سے متعین منافع دیا جاتا ہے۔ اس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ الفلاح اسلامی بینک نے 26 جولائی 2008ء کو اپنے ڈپازٹرز کے نام جو لیٹر جاری کیا ہے اس میں سٹار کے بغیر صاف لکھا ہے۔

”ہمارے ہاں اکاؤنٹ کھلوا کر ہائی پرافٹ ریٹ حاصل کریں۔“

اور مختلف مدتوں کے لحاظ سے مختلف ریٹ دیے گئے ہیں۔

✽ اگر آپ سودی بینک کے ساتھ لیز پر گاڑی لینے کا معاملہ کرتے ہیں تو بینک بکنگ کے لیے رقم جمع کروانے کی تاریخ سے ہی اپنا کرایہ وصول کرنا شروع کر دے گا خواہ آپ کو گاڑی تین ماہ بعد ملے کیوں؟

اس لیے کہ سودی نظام کا تقاضا ہے کہ جو رقم بینک کے کھاتے سے نکل گئی ہے بینک کو اس کا سود وصول ہو۔ کلائنٹ کو گاڑی کب ملتی ہے بینک کو اس سے غرض نہیں۔ اسلامی بینکوں میں رائج اجارہ میں بھی یہی ہوتا ہے مگر اس ترمیم کے ساتھ کہ اسلامی بینک ان تین ماہ کا کرایہ گاڑی ملنے کے بعد اس طرح وصول کرتا ہے کہ یا تو اس کو تمام اقساط میں ایڈجسٹ کر دیتا ہے یا پہلی قسط زیادہ رکھ کر یکمشت وصول کر لیا جاتا ہے۔ ثبوت کے لیے دیکھیے ماہر اسلامی بینکاری جناب محمد ایوب کی کتاب Under standing Islamic Finance صفحہ: 296۔ اسلامی بینک ان تین ماہ کا کرایہ سودی طریقہ کار کے تحت ہی لیتا ہے۔

تاخیر پر جرمانہ:

سودی بینکوں کی طرح اسلامی بینک بھی ادائیگی میں تاخیر پر جرمانہ کرتے ہیں جو کہ اسلامی بینک کے زیر نگرانی قائم خیراتی فنڈ میں جمع کروایا جاتا ہے۔ یہاں بھی سودی فارمولا اختیار کیا جاتا ہے کہ ایک تو جرمانہ واجب الادا رقم کے تناسب سے عائد کیا جاتا ہے اور دوسرا تاخیر کی مدت بڑھنے کے ساتھ جرمانہ کی رقم میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔

شریعت میں تاخیر پر جرمانہ کا تصور نہیں ہے:

قرآن و حدیث میں تاخیر پر جرمانہ کا تصور موجود نہیں اور نہ ہی فقہاء اس کی اجازت دیتے ہیں۔ امام مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

(( لا يحل ذنب من الذنوب مال انسان وان قتل نفسا ))

[الطرق الحکمیة: ص ۲۴۷]

”قتل سمیت کوئی گناہ انسان کے مال کو حلال نہیں کرتا۔“

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

((انما العقوبة في الايدان لا في الاموال)) [سنن بیہقی: باب

مايستدل به على ترك تضعيف الغرامة: ص ۲۸۸]

”سزا صرف جسمانی ہے نہ کہ مالی۔“

فقہ حنبلی کی معروف کتاب المغنی میں ہے:

((والتعزير يكون بالضرب والحبس والتوبيخ ولا يجوز قطع

شيء منه ولا جرحه ولا اخذ ماله لان الشرع لم يرد بشيء من

ذلك عن احد يقتدى به)) [ايضا - ج ۲۰، ص ۳۶۹]

”تعزیر مارنے، قید کرنے اور ڈانٹ ڈپٹ کے ذریعے ہوتی ہے اس کا کوئی حصہ

کاٹنا یا اسے زخمی کرنا یا اس کا مال لینا جائز نہیں کیونکہ جن لوگوں کی اقتداء کی جاتی ہے

ان کے حوالے سے شریعت میں اس طرح کی کوئی چیز بیان نہیں ہوئی۔“

فقہاء حنفیہ کے نزدیک بھی مالی جرمانہ جائز نہیں۔ چنانچہ علامہ ابن نجیم رحمۃ اللہ علیہ

لکھتے ہیں:

((والحاصل ان المذهب عدم التعزير بأخذ المال))

[البحر الرائق شرح كنز الدقائق: فصل في التعزير ج ۱۲ ص ۱۶۸]

”خلاصہ کلام یہ ہے کہ حنفی مذہب کے مطابق مال لے کر تعزیری سزا جائز نہیں۔“

فتاویٰ دارالعلوم دیوبند میں درمختار کے حوالے سے لکھا ہے:

((لا ياخذ المال في المذهب))

[فتاویٰ دارالعلوم: ج ۱۲، ص ۲۵۲]

”حنفی مذہب کے مطابق مالی جرمانہ درست نہیں۔“

نیز اسی صفحہ کے آخر میں ہے کہ جرمانہ مالی شرعاً درست نہیں۔

ماہرین اسلامی بینکاری کی نظر میں بھی جرمانہ جائز نہیں:

چونکہ ادائیگی میں تاخیر پر جرمانہ کے متعلق اسلامی بینکوں کا نقطہ نظر دلائل سے عاری

ہے اس لیے 1984 تک اسلامی بینکاری کے ماہرین کی بھی یہی رائے تھی کہ جرمانہ خواہ نیکی اور بھلائی کے کاموں پر خرچ کرنے کی نیت سے کیا جائے وہ جائز نہیں۔ چنانچہ جب دوسرے البر کہ سیمینار میں جو 4 تا 8 نومبر 1984 تیونس میں منعقد ہوا یہ سوال پیش کیا گیا:

”اسلامی بینک کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ مقروض کے لیے ضمنی طور پر یہ شرائط طے کرے کہ اگر وہ وقت پر قرض ادا نہیں کرے گا تو اسے اضافی رقم ادا کرنی ہوگی اور بالخصوص جب بینک یہ اضافی رقم نیکی اور بھلائی کے کاموں پر خرچ کرنے کے ارادے سے حاصل کرنا چاہتا ہو؟“

اس موقع پر اسلامی بینکاری کے جید علمائے کرام اور ماہرین معاشیات نے جو تحقیقات پیش کیں ان کا لب لباب یہ تھا کہ:

”یہ جائز نہیں ہے۔“ [جدید اقتصادی مسائل شریعت کی نظر میں: ص 43]

امام خطاب رضی اللہ عنہ کے قول سے غلط استدلال:

اسلامی بینکوں کے بعض حامی جرمانہ کے حق میں امام خطاب رضی اللہ عنہ کے اس قول سے استدلال کرتے ہیں۔

((اما اذا التزم المدعى عليه للمدعى انه ان لم يوفه حقه في وقت كذا وكذا فله عليه كذا وكذا فهذا لا يختلف في بطلانه لانه صريح الربا.....الى قوله واما اذا التزم انه لم يوفه حقه في وقت كذا فعليه كذا فلان او صدقة للمساكين فهذا هو محل الخلاف)) [اسلام اور جدید معیشت و تجارت: ص 145 از تقی عثمانی بحوالہ تحریر الکلام فی مسائل الالتزام]

”جب مدعا علیہ مدعی کے لیے اپنے اوپر یہ لازم کر لے کہ اگر وہ اس کا فلاں وقت پر حق ادا نہیں کرے گا تو وہ اس کو اتنی رقم ادا کرے گا تو اس کے باطل ہونے میں کوئی اختلاف نہیں کیونکہ یہ صریح سود ہے اور جب یہ پابندی عائد کر لے کہ فلاں وقت

اس کا حق ادا نہ کیا تو میں اتنے پیسے فلاں کو دوں گا یا مساکین پر صدقہ کروں گا تو اس کے جواز میں (قضاء) اختلاف ہے۔

اگر غور کیا جائے تو امام خطاب رحمۃ اللہ علیہ کے اس قول سے اسلامی بینکوں میں رائج مالی جرمانہ کا جواز ثابت نہیں ہوتا۔

✽ ایک تو اس لیے کہ اسلامی بینکوں میں تاخیر پر جو جرمانہ وصول کیا جاتا ہے وہ واجب الادا رقم کے تناسب سے ہوتا ہے اور مدت بڑھنے کے ساتھ ساتھ اس میں اضافہ بھی ہوتا جاتا ہے جبکہ امام خطاب رحمۃ اللہ علیہ کا یہ منشا قطعاً نہیں ہے۔

✽ دوسرا اس لیے کہ امام خطاب رحمۃ اللہ علیہ نے یہ نہیں فرمایا کہ وہ یہ کہے کہ میں اتنی رقم قرض خواہ کو دوں گا یا اس کی وساطت سے صدقہ کروں گا بلکہ انہوں نے تو فرمایا ہے کہ مدیون (Debtor) یہ کہے کہ میں اتنی رقم فلاں کو یعنی کسی دوسرے کو دوں گا یا مساکین پر صدقہ کروں گا اسلامی بینکوں میں یہ شرط ہوتی ہے کہ وہ اتنا جرمانہ بینک کے زیر نگرانی قائم خیراتی فنڈ میں جمع کروائے گا۔

✽ تیسرا اس لیے کہ امام خطاب رحمۃ اللہ علیہ نے التزام کا لفظ بولا ہے جس کا مطلب ہے کہ مدیون اپنے ذمہ یہ لے نہ کہ دوسرا شخص یہ شرط لگائے۔ اس کے برعکس اسلامی بینکوں میں بینک کی طرف سے یہ شرط ہوتی ہے۔

اسلامی بینکوں کا نقطہ نظر:

اسلامی بینکاری کے حامی کہتے ہیں ٹھیک ہے شریعت میں تاخیر پر جرمانہ درست نہیں مگر چونکہ اس سے بینک کی آمدن میں اضافہ نہیں ہوتا اس لیے یہ جائز ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ بے شک بینک کی آمدن میں اضافہ نہیں ہوتا مگر مدیون کی جیب سے تو اتنی رقم نکل جاتی ہے شریعت کا یہ منشا تو ہرگز نہیں ہے کہ قرض خواہ کی آمدن میں اضافہ ہو تو جرمانہ نا جائز ہے ورنہ جائز۔ اوپر فقہاء کے حوالے سے ہم نے جو عبارتیں نقل کی ہیں وہ بھی اس تاویل کو قبول کرنے سے اباہ کر رہی ہیں۔ نیز خود



اسلامی بینکاری کے سکارلز بھی اس کی اجازت نہیں دیتے۔

اسلامی بینک نان رسک ہیں:

سودی بینکوں کی طرح اسلامی بینک بھی Non Risk ہیں۔ اس کی واضح مثال یہ ہے کہ جب کوئی اسلامی بینک کے ساتھ مراہمہ یا اجارہ کا معاملہ کرنے جاتا ہے تو بینک اس سے اچھی خاصی رقم جو عام طور پر مطلوبہ چیز کی قیمت کا دس فیصد ہوتی ہے ٹوکن منی (حاشیہ) کے نام سے وصول کرتا ہے تاکہ اگر بعد میں وہ شخص چیز لینے سے انکار کر دے اور بینک کو وہ چیز دوسری جگہ قیمت لاگت سے کم پر فروخت کرنی پڑے تو بینک اس ٹوکن منی سے اپنا نقصان پورا کر سکے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کیا اسلامی بینکوں کے نزدیک یہ خطرہ مول لینا Risk میں شامل نہیں؟ ممکن ہے اسلامی بینکنگ کے محققین فرمائیں کہ ہمارے نزدیک اس قسم کے خطرے میں پڑنا Risk میں شامل نہیں اس پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر دوسری جگہ بیچنے پر بینک کو فائدہ ہو کیا وہ یہ نفع خریداری کا آڈر دینے والے شخص کو دینے کے لیے تیار ہے؟ ظاہر ہے بینک اس پر تیار نہیں ہوگا۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب بینک نقصان اٹھانے کے لیے تیار نہیں تو نفع کس بنیاد پر لیتا ہے؟

اسلامی بینکاری کے حامیوں کا نقطہ نظر یہ ہے کہ بینک کے لیے اس طرح کا خطرہ مول لینا ممکن نہیں کیونکہ بینک بنیادی طور پر تجارتی ادارہ نہیں اس کا جواب یہ ہے کہ یہ تو ان حضرات کے موقف کی تائید ہے جو کہتے ہیں کہ روایتی بینکوں کی طرح اسلامی بینک بھی صرف مالیاتی ثالث کا کردار ادا کرتے ہیں یعنی بچت کنندگان سے رقمیں جمع کر کے دوسروں کو فراہم کرتے ہیں اور ان سے مقرر شرح سے جو منافع ملتا ہے اس سے اپنا حصہ رکھ کر باقی کھاتہ داروں میں تقسیم کر دیتے ہیں۔ اشیاء کا لین دین تو صرف ایک حیلہ ہوتا ہے جو کاغذات کی حد تک ہوتا ہے عملاً بینک کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

اسلامی بینکنگ کے حامی جس کو Risk قرار دیتے ہیں وہاں بھی بینک خود کو

انشورنس کے ذریعے محفوظ رکھتا ہے اور انشورنس کی رقم بھی لاگت میں شمار کر کے کلائنٹ سے وصول کر لیتا ہے۔ یعنی رسک کی ساری ذمہ داری کلائنٹ کی ہے۔ اسلام میں حقیقی Risk اٹھائے بغیر نفع لینے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

اسلامی بینکوں میں رائج طریقہ ہائے تمویل (Modes of Financing):  
علاوہ ازیں اسلامی بینکوں میں سرمایہ کاری اور لوگوں کی مالی ضرورتیں پوری کرنے کے جو طریقے مضاربہ، مراہجہ، مشارکہ، اجارہ اور بیع توریق رائج ہیں وہ اس سادہ صورت میں موجود نہیں جو کتب حدیث و فقہ میں بیان ہوئی ہیں۔ جیسا کہ ذیل کی تفصیل سے ثابت ہوتا ہے۔

مضاربہ:

اسلامی بینکوں میں سرمایہ کاری کھاتے تقریباً مضاربہ کی بنیاد پر ہی کھولے جاتے ہیں۔ مضاربہ کو قراض اور معاملہ بھی کہا جاتا ہے اس کا اطلاق کاروبار کی اس صورت پر ہوتا ہے جس میں

”ایک سرمایہ کار (جس کو رب المال کہتے ہیں) اپنا سرمایہ کسی تاجر (مضارب یا عامل) کو دیتا ہے تاکہ وہ اس سے تجارت کرے۔ اور اس تجارت سے جو نفع حاصل ہو اس میں دونوں آپس میں طے شدہ تناسب سے شریک ہوں۔“

چنانچہ امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((القراض والمضاربة ان يدفع اليه ما لا ليتجر فيه والربح

مشارك)) [المنهاج: كتاب القراض ج ۱ ص ۲۲۹]

”قراض اور مضاربہ کا یہ مطلب ہے کہ ایک شخص دوسرے کو مال دے تاکہ وہ اس

میں تجارت کر لے اور نفع دونوں میں مشترک ہو۔“

نیل المآرب میں ہے:

((وهي شرعا ان يدفع انسان من ماله الى انسان آخر شبيهاً او

يكون له تحت يده على سبيل الوديعة او الغصب مال وياذن له ليتجر فيه ويكون الربح بينهما بحسب ما يتفقان عليه))

[نیل المآرب شرح دلیل الطالب ص ۱۹۴]

”مضار بہ کا شرعی معنی یہ ہے کہ ایک شخص دوسرے کو اپنے مال میں سے کچھ دے یا اس کا مال پہلے ہی سے بطور امانت اس کے پاس پڑا ہو یا اس نے غصب کر رکھا ہو اور وہ اس کو اجازت دے دے کہ وہ اس میں تجارت کرے اور نفع ان دونوں کے درمیان اس تناسب سے ہوگا جس پر وہ متفق ہوں۔“

الملخص الفقہی میں مضار بہ کا مفہوم یوں بیان ہوا ہے:

((دفع مال معلوم لمن يتجر به ببعض ربحه)) [ایضاً۔ ۲۔ ص ۷۱]  
 ”نفع کے کچھ حصے کے بدلے مال اس شخص کے حوالے کرنا جو اس کو تجارت میں لگائے۔“

مضار بہ کی صورت میں اگر تجارت میں خسارہ ہو جائے تو اس کا ذمہ دار صرف سرمایہ کار کا ہوتا ہے۔ تاجر اس میں حصہ دار نہیں ہوتا سوائے اس کے کہ وہ اپنی محنت کے ثمرہ سے محروم رہتا ہے جیسا کہ حضرت علیؑ سے منقول ہے:

((الوضیعة علی المال والربح علی ما اصطلحوا علیہ))

[مصنف عبد الرزاق: ج ۸ ص ۲۴۸]

”نقصان سرمایہ کار کا ہوگا اور نفع اس تناسب سے جس پر انہوں نے اتفاق کیا ہو۔“

مضار بہ کی حیثیت:

انام ابن قیمؒ کے نزدیک مضار بہ کی چار حیثیتیں ہیں:

(۱) امین (۲) اجیر (۳) وکیل (۴) شریک

وہ فرماتے ہیں کہ امین تو وہ اس اعتبار سے ہے کہ مال اس کے قبضہ میں ہے اور مال

میں تصرف کے اعتبار سے وہ وکیل ہے (مال کے مالک کا نمائندہ) اور عملی اعتبار سے اجیر

ہے جب اس مال میں نفع حاصل ہو جائے تو تب وہ شریک ہوگا۔

[الملخص الفقہی: ج ۲، ص ۷۱]

صاحب ہدایہ فرماتے ہیں جو مال مضارب کے حوالے کیا گیا ہے وہ اس کے پاس امانت ہے اور وہ اس میں وکیل بھی ہے کیونکہ وہ مال کے مالک کے حکم سے تصرف کرتا ہے جب فائدہ ہو تب وہ شریک بن جاتا ہے کیونکہ اپنے عمل کی بدولت مال کے ایک حصے کا مالک بن چکا ہے۔ [ہدایہ مع البناہ: ج ۱۰، ص ۴۴، ۴۵]

مضاربہ کی شرطیں:

مضاربہ میں جن شرطوں کا پایا جانا ضروری ہے ان میں سے ایک بنیادی شرط یہ ہے کہ نفع میں فریقین میں سے ہر ایک کے حصہ کا تناسب پہلے سے طے ہو مثلاً نفع سرمایہ کار اور تاجر میں برابر تقسیم ہوگا یا سرمایہ کار نفع کے ساٹھ فیصد اور تاجر چالیس فیصد کا حقدار ہوگا کیونکہ مضاربہ میں اصل عقد منافع پر ہوتا ہے اگر یہ مجہول ہو تو مضاربہ فاسدہ ہو جائے گا۔ جیسا کہ بدائع الصنائع ج ۳ ص ۱۷۱ میں ہے۔ امام مالک کے نزدیک نفع کی تقسیم کے وقت سرمایہ کار کا موقع پر موجود ہونا بھی ضروری ہے چنانچہ مؤطا میں ہے:

((قال مالك: في رجل دفع الى رجل مالا قراضا فعمل به فربح فارادا ان ياخذ حصته من الربح وصاحب المال غائب قال لا ينبغي له ان ياخذ منه شيئا الا بحضوره صاحب المال))

[كتاب القراض: باب المحاسبه في القراض]

”اس شخص کے بارے میں جو دوسرے کو مضاربہ کی بنیاد پر مال دیتا ہے وہ اسے کام میں لا کر نفع حاصل کرتا ہے اب وہ یہ چاہتا ہے کہ مال کے مالک کی غیر موجودگی میں ہی نفع سے اپنا حصہ لے لے امام مالک نے فرمایا جب تک مال کا مالک موجود نہ ہو اس کو یہ حق نہیں پہنچتا۔“

اسی طرح اگر کسی آدمی نے دوسرے کو مضاربہ کی بنیاد پر مال دیا اس نے تجارت کے

ذریعے نفع کمایا پھر اس المال کو الگ کر کے نفع سے اپنا حصہ لے لیا اور سرمایہ کار کا حصہ گواہوں کی موجودگی پر مال میں شامل کر دیا، امام مالک فرماتے ہیں کہ جب تک مال کا مالک موجود نہ ہو نفع تقسیم کرنا درست نہیں۔ اگر مضارب نے از خود کوئی چیز لی ہو تو وہ اسے واپس کرے حتیٰ کہ مال کا مالک اپنا مال وصول پالے پھر جو باقی بچے اس کو دونوں آپس میں تقسیم کر لیں۔ [حوالہ مذکورہ]

امام مالک رضی اللہ عنہ کی بات ہر لحاظ سے عقلی میزان پر پورا اترتی ہے اس لیے کوئی دانشور اس سے اختلاف نہیں کر سکتا۔ بات تو سیدھی سی ہے کہ جب سرمایہ کار اور تاجر دونوں نفع میں شریک ہیں تو کیا تاجر کا فرض نہیں کہ وہ سرمایہ کار کو اعتماد میں لے اور بتائے کہ میں نے یہ کاروبار کیا اتنے اخراجات آئے باقی یہ نفع ہے نہ کہ سب فیصلے خود ہی کر لے۔ مضاربہ کا میدان:

اکثر فقہاء کے نزدیک مضاربہ کا مال تجارتی سرگرمیوں کے علاوہ استعمال نہیں کیا جا سکتا چنانچہ امام نووی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

((عقد القراض يقتضى تصرف العامل فى المال بالبيع والشراء، فإذا قارضه على أن يشتري به نخلا يمسك رقابها ويطلب ثمارها لم يجز لانه قيد تصرفه الكامل بالبيع والشراء، ولأن القراض مختص بما يكون النماء فيه نتيجة البيع والشراء وهو فى النخل نتيجة عن غير بيع وشراء فبطل أن يكون قراضا ولا يكون مساقاة، لانه عاقده على جهالة بها قبل وجود ملكها، وهكذا لو قارضه على شراء دواب أو مواشى يحبس رقابها ويطلب نتاجها لم يجز لما ذكرنا))

[المجموع: ج ۴ ص ۳۷۱]

”عقد مضاربہ یہ تقاضا کرتا ہے کہ مضارب مال میں خرید و فروخت کے ذریعے تصرف کرے چنانچہ جب وہ اس طرح مضاربہ کرے کہ وہ اس مال سے کھجوروں

کے درخت خریدیگا اور ان سے پھل حاصل کرے گا تو یہ جائز نہیں کیونکہ قید یہ ہے کہ کامل تصرف خرید و فروخت کے ذریعے ہو اور دوسری وجہ یہ ہے کہ مضاربہ ان معاملات کے ساتھ مختص ہے جہاں مال میں اضافہ خرید و فروخت کے نتیجے میں ہو جبکہ کھجوروں میں یہ اضافہ خرید و فروخت کے نتیجے میں نہیں اس لیے اس کا مضاربہ باطل ٹھہرا اور یہ مساقات کا معاملہ بھی نہیں ہو سکتا کیونکہ اس صورت میں یہ کھجوروں کی ملکیت وجود میں آنے سے پہلے مجہول درختوں پر عقد ہوگا اسی طرح اگر اس طرح مضاربہ کر لے کہ وہ جانور یا مویشی خریدے گا جو بذات خود تو اس کے پاس محفوظ ہونگے مگر ان کی پیداوار حاصل کرے گا تو یہ بھی جائز نہیں وجہ وہی ہے جو ہم نے اوپر ذکر کی ہے یعنی یہ نفع خرید و فروخت کے نتیجے میں حاصل نہیں ہوا۔

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

((لو قارضه على أن يشتري الحنطة فيطحنها ويخبزها والطعام ليطنخه ويبيعه والغزال لينسجه والثوب أو ليقصده والدبغ بينهما فهو فاسد..... قارضه على دراهم على أن يشتري نخيلا أو دواب أو مستغلات ويمسك رقابها لثمارها ونتاجها وغلاتها وتكون الفوائد بينهما فهو فاسد لأنه ليس ربحاً

بالتجارة بل من عين المال)) [روضة الطالبين: ج ۲، ص ۱۸۸]

”اس کا مطلب یہی ہے کہ مضاربہ کا مال تجارتی سرگرمیوں کے علاوہ دوسری پیداواروں سیکموں میں استعمال نہیں ہو سکتا جیسے کوئی اس بات پر مضاربہ کر لے کہ وہ گندم خرید کر اسے پیسے گا اور روٹی پکا کر اسے بیچے گا اور نفع دونوں میں تقسیم ہوگا تو یہ مضاربہ فاسد ہوگا کیونکہ یہ نفع تجارت کے ذریعے حاصل نہیں ہوا بلکہ خود مال سے جنم لیا ہے“

امام ابوالقاسم عبدالکریم الرافی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

((لو قارضه على ان يشتري الحنطة فيطحنها ويخبزها

والطعام ليطبخه ويبيع والربح بينهما فهو فاسد ..... أن  
الطبخ والخبز ونحوهما أعمال مضبوطة يمكن الاستئجار  
عليها وما يمكن الاستئجار عليه فيستغنى عن الفراض إنما  
القراض لما لا يجوز الاستئجار عليه وهو التجارة التي لا

ينضبط قدرها)) [فتح العزيز، شرح الوجيز: ج ۱۲، ص ۱۱]

”یعنی مضاربہ کے مال سے صرف تجارت کی جاسکتی ہے دوسرے نفع بخش کاموں  
میں لگانے کی اجازت نہیں کیونکہ مضاربہ وہاں ہوتا ہے جہاں اجارہ نہ ہو سکے اور وہ  
تجارت ہے جہاں اجارہ ہو سکے وہاں مضاربہ کی ضرورت نہیں ہوتی۔“  
فقہاء حنفیہ کے نزدیک بھی مضاربہ کا مال صرف تجارت اور اس سے متعلقہ سرگرمیوں  
میں ہی لگایا جاسکتا ہے جیسا کہ ہدایہ میں ہے:

((فینتظم العقد صنوف التجارة وما هو من صنيع التجار))

[هدایہ مع البناہ: ج ۱۰ ص ۵۲]

”مضاربہ کا عقد تجارتی سرگرمیوں کو ہی شامل ہے جبکہ یہ (خاص مسئلہ کی طرف  
اشارہ) تاجروں کا کام نہیں ہے“

دوسری جگہ ایک مسئلہ کی وضاحت میں لکھتے ہیں کہ یہ:

”امام محمد اور امام ابوحنیفہ رحمہما اللہ کے نزدیک اس لیے جائز نہیں کہ یہ تجارت میں شامل  
نہیں اور عقد مضاربہ کا مقصد صرف تجارت میں کسی کو ایجنٹ بنانا ہے۔“  
مزید لکھتے ہیں:

”جب یہ تجارت نہیں تو مضاربہ میں بھی شامل نہیں۔“

[هدایہ مع البناہ: ج ۱۰ ص ۸۷]

علامہ زکریا انصاری رحمہ اللہ رقم طراز ہیں:

((لَوْ قَارَضَهُ عَلَى أَنْ يَشْتَرِيَ بِالْذَّرَاهِمِ نَحْلًا لَيْسَتْ غَلَّةٌ، وَالرَّبْحُ

بَيْنَهُمَا؛ لِأَنَّ مَا حَصَلَ لَيْسَ بِتَصَرُّفِ الْعَامِلِ، وَإِنَّمَا هُوَ مِنْ

عَيْنِ الْمَالِ)) [البهجة الوردية: باب القراض: ج ۱۱، ص ۴۸۰]

”اگر کوئی یوں مضاربہ کر لے کہ وہ درہموں سے کھجوروں کے درخت خریدے گا

تاکہ ان کی آمدن حاصل کرے اور نفع دونوں کے درمیان تقسیم ہوگا تو یہ بھی جائز

نہیں کیونکہ اس صورت میں جو نفع حاصل ہوا ہے وہ مضارب کے تصرف کا نتیجہ

نہیں ہے وہ تو خود مال کا کمال ہے۔“

مذکورہ بالا عبارتیں اس امر کا بین ثبوت ہیں کہ ان جلیل القدر فقہاء کے نزدیک

مضاربہ کا مال تجارتی سرگرمیوں کے علاوہ دوسرے نفع بخش منصوبوں میں استعمال

نہیں ہو سکتا۔

ایک تو اس لیے کہ دوسرے منصوبوں کے ذریعے جو فائدہ حاصل ہوگا وہ مضارب کی

محنت کی بجائے خود مال کا نتیجہ ہوگا۔ جیسا کہ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ اور علامہ زکریا انصاری رحمۃ اللہ علیہ

نے ذکر کیا ہے۔

اور دوسرا اس لیے کہ مضاربہ اس چیز میں ہوتا ہے جو غیر منضبط ہو اور وہ صرف تجارت

ہے۔ جہاں اجارہ ہو سکے وہاں مضاربہ کی ضرورت نہیں ہوتی جیسا کہ امام عبدالکریم

الرافعی نے ذکر کیا ہے۔

چونکہ دلائل کے اعتبار سے یہ نقطہ نظر قوی ہے اس لیے اسلامی بینکاری کے حامی بھی

یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہیں کہ بنیادی طور پر مضاربہ تجارت میں ہی ہوتا ہے۔ دوسرے زرعی

اور صنعتی منصوبوں میں اس کا استعمال اس کے مفہوم میں وسعت پیدا کر کے کیا جانے لگا

ہے چنانچہ عالمی سطح پر اسلامی بینکوں کی شرعی رہنمائی کے لیے قائم تنظیم

”هيئة المحاسبة والمراجعة للمؤسسات المالية الإسلامية“

Accounting And Auditing Organization for Islamic

Financial Institutions (مخفف: AAOFI) کے شائع کردہ المعايير

الشرعية (شریعیہ سٹینڈرڈز) میں ہے۔



((والمضاربة من الصيغ التي تستخدم غالباً في التجارة ثم توسعت استخداماتها حتى شملت مجالات الاستثمار التجارية والزراعية والصناعية والخدمية وغيرها)) [ايضاً- ص ۲۳۲]

”مضاربتہ ان طریقوں میں سے ہے جو زیادہ تر تجارت میں استعمال کیا جاتا ہے پھر اس کے استعمال میں وسعت پیدا ہوگی یہاں تک کہ تجارتی، زرعی اور صنعتی سرمایہ کاری وغیرہ کو بھی شامل ہو گیا۔“

مضاربتہ کے مفہوم میں یہ وسعت کس نے پیدا کی کب کی اور کس بنیاد پر کی؟ ہمیں پورا یقین ہے کہ اسلامی بینکنگ کے حامیوں کے پاس اس کا کوئی ایسا جواب نہیں ہے جو اہل علم کو مطمئن کر سکے یہی وجہ ہے کہ المعايير الشرعية کے قابل احترام علمائے کرام نے اس کے متعلق اس سے زیادہ لب کشائی نہیں فرمائی۔

اسلامی بینکوں میں رائج مضاربتہ کی حقیقت:

اگر اسلامی بینکاری کا گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے تو صاف پتہ چلتا ہے کہ اسلامی بینکوں میں رائج مضاربتہ میں اوپر بیان کردہ اصولوں اور شرطوں کا پوری طرح خیال نہیں رکھا جاتا اور نہ ہی یہ عدل و انصاف پر مبنی ہے۔ اسکی وضاحت کے لیے ذیل کی سطور ملاحظہ فرمائیں۔

✽ اگرچہ اسلامی بینکوں میں یہ سہولت موجود ہے کہ اگر کوئی ڈیپازیٹر یہ جاننا چاہے کہ نفع کی تقسیم کس تناسب سے ہوگی تو متعلقہ بینک کے ذمہ دار بتانے کے پابند ہیں یا وہ خود بھی بینک کی ویب سائٹ پر دیکھ سکتا ہے مگر ساتھ ہی یہ بھی ہوتا ہے کہ ڈیپازیٹر سے جس فارم پر دستخط کروائے جاتے ہیں اس میں صاف لکھا ہوتا ہے کہ بینک یہ تناسب تبدیل کرنے کا بھی مجاز ہے تاہم اس صورت میں بینک کی ذمہ داری ہوگی کہ وہ تبدیل شدہ تناسب اپنی ویب سائٹ پر جاری کرے یا لکھ کر نوٹس بورڈ پر

آویزاں کرے۔ اب یہ تبدیل شدہ تناسب کتنی مدت کے لیے ہوگا اس کا ذکر نہیں ہوتا حالانکہ اسلامی بینکنگ کے مؤیدین بھی اس بات کے قائل ہیں کہ یہ صراحت ہونی چاہیے کہ نفع کی تقسیم کا یہ فارمولا کب تک چلے گا۔ [المعايير الشرعية ص: ۲۲۴]

اسلامی بینک منافع کی تقسیم کے لیے مدت اور رقم کی کمی بیشی کی بنیاد پر ڈیپازٹرز کی رقوم کا الگ الگ "وزن" مقرر کرتے ہیں یعنی جس کی رقم اور مدت زیادہ ہو اس کا وزن زیادہ اور جس کی کم ہو اس کا وزن کم رکھا جاتا ہے۔ مثلاً میزان بینک کی ویب سائٹ سے حاصل کردہ معلومات کے مطابق ماہ اپریل 2008ء کا وٹج اسائنڈیوں ہے: اگر رقم 10,000 سے لیکر ایک لاکھ سے کم تک ہو تو وٹج 0.31 ہوگا اور اگر رقم ایک لاکھ سے لیکر 0.99 ملین تک ہو تو وٹج 0.36 تک ہوگا۔ نفع کی تقسیم کا یہ طریقہ کار بھی سودی ذہنیت کی غمازی کرتا ہے۔

مروجہ اسلامی بینکاری کے محققین اس کی تائید میں سب سے بڑی دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ مختلف شرکاء کے لیے منافع کی مختلف شرحیں طے کی جاسکتی ہیں یعنی ایک فریق کے لیے نفع کا تناسب چالیس اور دوسرے کیلئے پچاس فیصد رکھا جاسکتا ہے مگر ہمارے یہ محققین یہ بھول گئے کہ اس کو مدت اور رقم کی کمی بیشی سے جوڑنے میں ربا کا شبہ پایا جاتا ہے لہذا اس کو مطلق جائز قرار دینا خطرے سے خالی نہیں۔

یہاں ایک اور زیادتی بھی کی جاتی ہے وہ یہ کہ مضاربہ میں بینک کی اپنی رقم بھی ہوتی ہے لیکن بینک اس کا وزن ڈیپازٹرز کی رقوم سے زیادہ رکھتا ہے۔ مثلاً اسی ماہ اپریل میزان بینک نے اپنی رقم کا وٹج 1.7 رکھا ہے۔ یہ فرق خود اس اصول کے بھی خلاف ہے وہ اس طرح کہ اگر بینک نے مضاربہ میں مثلاً ایک ارب روپیہ لگایا ہے اور اس میں نوے کروڑ کھاتہ داروں کا اور دس کروڑ بینک کا تو اس اصول کے مطابق کھاتہ داروں کی رقم کا وٹج بینک کی رقم سے زیادہ ہو جانا چاہیے کیونکہ مجموعی اعتبار سے کھاتہ

داروں کی رقم زیادہ ہے لیکن بینک نے الٹا اپنی رقم کا وٹج زیادہ رکھا ہوتا ہے اگر یہ اصول درست ہے تو بینک اور کھاتہ دار دونوں کے لیے یکساں ہونا چاہیے۔

فائدہ: رقم کی کمی بیشی کی بنیاد پر مختلف وزن دینے کو خود اسٹیٹ بینک غلط کہہ چکا ہے۔ دیکھیے B-C-D کا جاری کردہ سرکیولر نمبر 6 بتاریخ 12-7-1987۔

ممکن ہے یہاں کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ جب اسٹیٹ بینک نے ۱۹۸۷ء میں اس سے روک دیا تھا پھر اسلامی بینک ایسا کیوں کر رہے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ بعد میں جب کچھ وجوہ کی بنا پر یہ پابندی اٹھالی گئی تو اسلامی بینکوں نے بھی استفادہ شروع کر دیا مگر سوال یہ ہے کہ کیا اسٹیٹ بینک کی پابندی ختم ہونے سے ایک غلط کام جائز ہو جاتا ہے۔

✽ اسلامی بینکوں میں رائج مضاربہ میں تیسری خرابی یہ ہے کہ ڈیپازٹرز بینک کا شریک ہے۔ اس ناطے بینک پر لازم ہے کہ اس کو اعتماد میں لے جس طرح بینک اپنے شیئر ہولڈرز کے ساتھ معاملہ کرتا ہے اور بورڈ آف ڈائریکٹرز ہولڈرز کی نمائندگی کرتا ہے۔ بینک سے متعلقہ ہر چیز اس کے علم میں ہوتی ہے۔ اس کے برعکس ڈیپازٹرز کو کوئی علم نہیں ہوتا کہ بینک کیا کر رہا ہے اور کتنا نفع ہوا ہے جو بینک دے دے کھاتہ دار پر اس کو قبول کرنا فرض ہوتا ہے۔ اسلامی بینکوں کے فارمز میں بھی یہ درج ہوتا ہے کہ بینک نے جو نفع تقسیم کر دیا ڈیپازٹرز اس کو قبول کرنے کا پابند ہوگا کسی کو اعتراض کا حق نہیں ہوگا۔ ہم اسلامی بینکاری کے حامیوں سے پوچھتے ہیں کہ کیا یہ شرط قرین انصاف ہے؟

اسلامی بینکاری کے سکالر ڈاکٹر رفیق یونس مصری اسلامی بینکنگ میں حائل موانع اور مشکلات ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

((الا ان المود عين يشكون من صعوبة اخري هي انهم

شركاء فيما بينهم بالمال ولكنهم مشتتون لا تجمعهم اى

جمعية او هيئة لحماية مصالحهم حيال المساهمين في  
المصرف الذين تجمعهم جمعية عمومية ويمثلهم مجلس  
ادارة)) [المصارف الاسلاميه: ص ٢٥]

”بلاشبہ ڈیپازٹریٹ اور مشکل کا شکوہ کرتے ہیں وہ یہ کہ وہ مال کے ساتھ بینک کے  
شریک ہیں لیکن بینک میں حصہ دار جن کی نمائندگی بورڈ آف ڈائریکٹرز کر رہا ہوتا ہے  
کے مقابلے میں ان کے مفادات کے تحفظ کے لیے کوئی تنظیم یا بورڈ نہیں۔“

✽ چوتھی بڑی خرابی یہ ہے کہ اسلامی بینک فقہاء کی اکثریت کے نقطہ نظر کے مطابق  
مضاربہ کا مال صرف تجارت میں ہی نہیں لگاتے بلکہ دوسرے منصوبوں پر بھی  
لگاتے ہیں۔

مراہحہ (Murabaha):

مروجہ اسلامی بینکوں نے فنانسنگ کے جو مختلف طریقے متعارف کرائے ہیں ان  
میں سرفہرست مراہحہ ہے۔ جس کو اسلامی بینکنگ کے نام پر وسیع پیمانے پر فروغ  
حاصل ہوا ہے۔

بیع مراہحہ کا مفہوم یہ ہے۔

”فروخت کنندہ کوئی چیز اس وضاحت کے ساتھ بیچے کہ میں نے یہ اتنے میں خریدی  
ہے اور اب اتنے منافع کے ساتھ فلاں قیمت پر تمہیں فروخت کرتا ہوں۔“

چنانچہ علامہ موفق الدین ابی محمد عبداللہ بن احمد بن محمد قدامہ حنبلی مقدسی فرماتے ہیں:

((مَعْنَى بَيْعِ الْمُرَابَحَةِ، هُوَ الْبَيْعُ بِرَأْسِ الْمَالِ وَرِبْحٍ مَعْلُومٍ،  
وَيُشْتَرَطُ عِلْمُهُمَا بِرَأْسِ الْمَالِ فَيَقُولُ رَأْسُ مَالِي فِيهِ أَوْ هُوَ

عَلَى بِمِائَةٍ بَعْتُكَ بِهَا، وَرِبْحٌ عَشْرَةٌ)) [المغنی: ٦، ص ٢٦٦]

”مراہحہ کا معنی ہے اصل لاگت اور متعین نفع کے ساتھ فروخت کرنا اس میں ضرور  
ہے کہ فروخت کنندہ اور مشتری کو اصل لاگت معلوم ہو، چنانچہ بیچنے والا کہے کہ اس

میں میرا اصل سرمایہ سو ہے یا یہ مجھے ایک سو کی پڑی ہے میں آپ کو دس نفع لے کر اتنے میں بیچتا ہوں۔“

لغت کی مشہور کتاب ”المعجم الوسیط“ میں ہے:

((هو بیع برأس المال مع زیادة معلومة))

اصل قیمت پر متعین نفع کے ساتھ فروخت کرنا بیع مراہجہ ہے۔ عام بیع اور مراہجہ میں یہ فرق ہے کہ عام بیع میں چیز کی اصل قیمت اور اپنا نفع بتانا ضروری نہیں ہوتا جبکہ مراہجہ میں مشتری کو اصل قیمت سے آگاہ کرنا لازمی شرط ہے۔

مراہجہ کی ضرورت اور اس کے بنیادی اصول:

مراہجہ ایک تمدنی اور معاشرتی ضرورت ہے کیونکہ ہر آدمی میں یہ صلاحیت نہیں ہوتی کہ وہ کسی چیز کو اس کی اصل قیمت پر مناسب نفع کے بدلے خرید سکے بعض دفعہ تو فروخت کنندہ اصل قیمت سے بھی کئی گنا زیادہ نفع مانگ لیتا ہے۔ اس بناء پر انسان سوچتا ہے کہ کوئی ایسا شخص مل جائے جو اپنی لاگت پر معقول نفع لے کر بیچنے پر تیار ہو۔ اس لحاظ سے بیع مراہجہ کی بنیاد امانت داری پر ہے لہذا اس کا بنیادی اصول یہ ہے کہ یہ ہر قسم کی خیانت اور غلط بیانی سے مبرا ہو اور مشتری کو اصل قیمت کا علم ہو جیسا کہ ”الموسوعة الفقیة الكويتية“ میں ہے۔

((یشترط ان یکون الثمن الاول معلوما للمشتري الثاني لان

العلم بالثمن شرط فی صحة البیوع فاذا لم یعلم الثمن الاول

فسد العقد))

”اس میں یہ شرط ہے کہ مشتری ثانی کو پہلی قیمت کا علم ہو۔ کیونکہ بیوع کے صحیح

ہونے کے لیے قیمت کا علم شرط ہے۔ جب پہلی قیمت کا علم نہیں ہوگا تو عقد فاسد

ہو جائے گا۔“

مراہجہ کی مختلف قسمیں اور ان کا شرعی حکم:

نفع کے تعین کے اعتبار سے مراہجہ کی دو صورتیں ہیں:

۱۔ پوری قیمت پر نفع کی ایک مخصوص مقدار مقرر کر لی جائے۔ مثلاً یوں کہا جائے کہ اس قیمت سے اتنے روپے زائد میں بیچتا ہوں یہ صورت سب کے نزدیک جائز ہے۔

چنانچہ علامہ موفق الدین ابی محمد عبداللہ بن احمد بن محمد قدامہ حنبلی مقدسی رقم طراز ہیں:

((فَهَذَا جَائِزٌ لَا خِلَافَ فِي صِحَّتِهِ، وَلَا نَعْلَمُ فِيهِ عِنْدَ أَحَدٍ

كَرَاهَةً)) [المغنی: ۶ ص ۲۶۶]

”یہ جائز ہے کہ اس کے صحیح ہونے میں کوئی اختلاف نہیں ہمیں نہیں علم کہ اس کے

متعلق کسی سے کراہت منقول ہو۔“

۲۔ دوسری صورت یہ ہے کہ نفع کا ایک خاص تناسب طے کر لیا جائے مثلاً یوں کہا جائے

کہ اصل قیمت پر اتنے فیصد زائد نفع وصول کروں گا۔ صحابہ اور فقہاء کے ہاں یہ

صورت بیع دہ دہ یا دہ دہ ”یا“ دہ دہ دہ کے نام سے مشہور ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ

اس چیز میں میرا اصل سرمایہ اتنے روپے ہے اور میں ہر دس کے بدلے ایک روپیہ یا

ہر دس کے بدلے دو روپے نفع لوں گا اس کے جواز میں اختلاف ہے۔

قاضی شریح سعید بن مسیب اور ابراہیم نخعی اس کے جائز ہونے کے قائل ہیں۔

چنانچہ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نقل فرماتے ہیں:

((عن شریح و سعید بن المسیب و ابراہیم النخعی انہم کانوا

یجیزون بیع دہ دہ و ازدہ)) [السنن الکبریٰ: کتاب البیوع، باب المرابحہ]

”شریح سعید بن مسیب اور ابراہیم نخعی بیع دہ دہ و ازدہ جائز قرار دیتے ہیں۔“

امام ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے:

((لا باس بیع دہ دہ و ازدہ)) [مصنف عبدالرزاق: کتاب البیوع،

باب بیع دہ دہ و ازدہ]

”بیعِ دوازده میں کوئی حرج نہیں۔“

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا رجحان بھی اسی طرف ہے۔ چنانچہ انہوں نے حضرت محمد بن سیرین رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول نقل کیا ہے:

(( لَا بَأْسَ الْعَشْرَةَ بِأَحَدٍ عَشَرَ ، وَيَأْخُذُ لِلنَّفَقَةِ رِبْحًا ))

[صحیح بخاری: کتاب البیوع، باب من اجری الامصار علی

مایتعارفون بینہم فی البیوع والاجازة]

”اس میں کوئی حرج نہیں کہ دس کو گیارہ کے بدلے بیچے اور اخراجات پر بھی نفع وصول کریں۔“

شیخ الاسلام حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ اس کی تشریح میں لکھتے ہیں:

((أَيُّ لَا بَأْسَ أَنْ يَبِيعَ مَا اشْتَرَاهُ بِمِائَةِ دِينَارٍ مَثَلًا كُلُّ عَشْرَةٍ مِنْهُ بِأَحَدٍ عَشَرَ فَيَكُونُ رَأْسُ الْمَالِ عَشْرَةً وَالرَّبْحُ دِينَارًا ))

[فتح الباری: ج ۴ ص ۵۱۳]

”یعنی اس میں کوئی حرج نہیں کہ جو چیز سودینار کی خریدی ہے وہ اس طرح بیچے کہ ہر دس کے بدلے گیارہ دیناروں کا تو اصل مال دس دینار ہوئے اور ایک دینار نفع۔“

امام ثوری رحمۃ اللہ علیہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اہل الرائے اور ابن منذر کی رائے میں بھی یہ

جائز ہے۔ [المغنی: ۶ ص ۲۶۶]

اس کے برعکس حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی رائے

میں مراہجہ کی یہ صورت ناجائز ہے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

((بيع ده دوازده ربا)) [مصنف عبدالرزاق: کتاب البیوع، باب

بيع ده دوازده]

”بیعِ دوازده سود ہے۔“

اور عبداللہ بن ابی یزید کہتے ہیں:

(( سمعت ابن عباس یکرہ بیع دہ دوازده قال و ذاک بیع  
الاعاجم )) [ السنن الکبریٰ للبیہقی و مصنف عبدالرزاق: کتاب  
البیوع، باب المرابحة ]

”میں نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے سنا کہ وہ بیع دہ دوازده کو مکروہ سمجھتے تھے فرماتے  
تھے یہ عجمیوں کی بیع ہے۔ امام احمد نے بھی اس کو مکروہ کہا ہے اور امام اسحاق بن  
راہویہ کے خیال میں بھی یہ ناجائز ہے۔“

رائح رائے:

اگر فریقین کے دلائل کا موازنہ کیا جائے تو حسب ذیل وجوہ کے باعث ان  
بزرگوں کی رائے رائج معلوم ہوتی ہے جو اس کے حق میں ہیں۔

\* قرآن و حدیث میں کوئی ایسی نص نہیں جو اس کی حرمت پر دلالت کرتی ہو۔ نیز اس  
سے کسی شرعی ضابطے کی خلاف ورزی بھی نہیں ہوتی۔

\* پہلی قسم کی طرح اس میں بھی ہر چیز واضح ہے اصل لاگت بھی معلوم ہوتی ہے اور نفع  
بھی متعین ہے۔

\* جہاں تک عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے آثار کا تعلق ہے  
انکے بارہ میں امام بیہقی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔

(( وهذا یحتمل ان یکون انما نہی عنہ إذا قال ہو لک بدہ  
یازدہ أو قال بدہ دوازده لم یسم راس المال ثم سماہ عند  
النقد و كذلك ما روی عن ابن عمر فی ذلك )) [ السنن الکبریٰ:

کتاب البيوع، باب المرابحة ]

”اس کا مطلب ہے کہ یہ ممانعت تب ہے جب یہ کہے کہ یہ چیز میں تجھے اس طرح  
فروخت کرتا ہوں کہ ہر دس کے بدلے ایک یا ہر دس کے بدلے دو نفع لوں گا۔ اصل



لاگت کا تذکرہ نہ کرے پھر ادائیگی کے وقت اس کی وضاحت کرے۔“

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت کا بھی یہی مطلب ہے۔ یاد رہے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا اثر سنداً بھی ثابت نہیں کیونکہ اس کو سفیان بن عیینہ صیغہ عن سے بیان کر رہے ہیں اور وہ مدلس ہیں۔

مراہجہ میں ضمنی اخراجات کا حکم:

یہاں یہ امر بھی قابل ملاحظہ ہے کہ بیچی جانے والی چیز پر جو اخراجات آتے ہیں فروخت کنندہ ان کو بھی اصل لاگت میں شامل کر کے مجموعی لاگت پر نفع حاصل کر سکتا ہے۔ اوپر صحیح بخاری کے حوالے سے حضرت محمد بن سیرین رضی اللہ عنہ کا یہ قول نقل ہوا ہے کہ فروخت کنندہ اخراجات پر بھی نفع لے سکتا ہے۔ شیخ الاسلام حافظ ابن حجر رضی اللہ عنہ رقم طراز ہیں:

((للبيع ان يحسب في المراجعة جميع ما صرفه ويقول قام

على بكذا)) [فتح الباری: ۴ ص ۵۱۳]

”مراہجہ میں بائع کو یہ بھی حق ہے کہ وہ تمام اخراجات کو شمار کر کے یہ کہے کہ مجھے یہ چیز اتنی رقم (قیمت) میں پڑی ہے۔“

بیع مراہجہ اور بینکاری:

مذکورہ بالا تفصیل سے مراہجہ کا شرعی تصور اور اس کے اصول و مبادی نکھر کر سامنے آگئے ہیں اور یہ بھی واضح ہو گیا ہے کہ اس کا بینکاری کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ چنانچہ اسلامی بینکاری کے حامی مولانا مفتی تقی عثمانی صاحب لکھتے ہیں:

”یہ اصطلاح آج کل معاشی حلقوں میں ایک بینکاری کے طریقے کے طور پر مروج

ہے۔ جبکہ مراہجہ کا اصل تصور اس خیال سے مختلف ہے۔ مراہجہ اصل میں اسلامی فقہ

کی ایک اصطلاح ہے اور اس سے مراد ایک قسم کی بیع ہوتی ہے۔ جس کا اپنے اصل

تصور کے اعتبار سے تمویل کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔“ [اسلامی بینکاری کی

بنیادیں: ص ۹۶]

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

”بنیادی طور پر مباحہ طریقہ تمویل نہیں بلکہ بیع کی ایک خاص قسم ہے۔ شریعت کی رو سے تمویل کے مثالی طریقے ”مشارکہ“ اور ”مضار بہ“ ہیں۔“  
آگے چل کے لکھتے ہیں:

”یہ بات کسی صورت نظر انداز نہیں ہونی چاہیے کہ مباحہ اصل کے اعتبار سے طریقہ تمویل نہیں۔ یہ تو صرف سود سے بچنے کا ایک وسیلہ اور حیلہ ہے۔ ایسا مثالی ذریعہ تمویل نہیں جو اسلام کے معاشی مقصد کی تکمیل کرتا ہو۔“ [اسلامی بینکاری کی بنیادیں: ۱۰۸]

اسلامی بینکوں میں رائج مباحہ:

اسلامی بینکوں میں رائج مباحہ اصل میں ”المرا بحة للامر بالشراء یا المرابحة للواعد بالشراء یعنی خریداری کا آرڈر دینے یا خریداری کا وعدہ کرنے والے کے ساتھ مباحہ کا معاملہ کرنا ہے۔ اس کو مباحہ مُرَابَّہ بھی کہتے ہیں۔

اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ کلائنٹ بینک سے درخواست کرتا ہے کہ آپ میرے لیے اس کوالٹی کی فلاں فلاں چیز خرید لیں میں وہ مباحہ کی بنیاد پر آپ سے خرید لوں گا۔ شرح منافع کا تعین پہلے ہی ہو جاتا ہے۔ اور اس کا تعین شرح سود سے کیا جاتا ہے۔ عام طور پر بینک کلائنٹ کی دلچسپی جانچنے کے لیے ٹوکن منی (الحامش الجدی) بھی وصول کرتا ہے پھر جب بینک حسب وعدہ مطلوبہ سامان خرید لیتا ہے تو باقاعدہ بیع کے ذریعے کلائنٹ کو فروخت کرتا ہے اور کلائنٹ عموماً اپنے وعدے کے مطابق خریدنے کا پابند ہوتا ہے۔ بعض دفعہ بینک پر بھی وعدے کی پابندی لازم ہوتی ہے لیکن عموماً بینک آزاد ہی ہوتا ہے۔ اگر بینک کے سامان خریدنے کے بعد کلائنٹ حسب وعدہ خریدنے سے انکار کر دے تو بینک وہ سامان کسی دوسرے کو بیچ دیتا ہے اور اصل لاگت سے جتنا

خسارہ ہوتا ہے وہ وعدہ کرنے والے سے وصول کرتا ہے۔ بینک چونکہ تجارتی ادارہ نہیں اس لیے وہ خود سامان خریدنے کی بجائے اس کلائنٹ کو ہی خریداری کے لیے وکیل مقرر کر دیتا ہے کہ آپ یہ سامان خود خرید لیں۔ اور اکثر کلائنٹ اپنا سپلائی بھی خود متعین کرتا ہے اور اس کا مطالبہ ہوتا ہے کہ بینک اسی سے مطلوبہ سامان خرید کر اسے فروخت کرے۔ کلائنٹ کا بینک کے ساتھ یہ معاہدہ بھی ہوتا ہے کہ بیع کے بعد اگر اس نے وعدے کے مطابق ادائیگی نہ کی تو وہ اتنی رقم بینک کے زیر نگرانی قائم خیراتی فنڈ میں جمع کروائے گا۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ اسلامی بینکوں میں رائج مراہجہ قطعاً وہ نہیں جس کو ہمارے اسلاف نے جائز قرار دیا ہے بلکہ اس میں اور شرعی مراہجہ میں کئی اعتبار سے فرق ہے۔

✽ شرعی مراہجہ میں بیچا جانے والا سامان تاجر کے پاس پہلے سے موجود ہوتا ہے اس کے برعکس اسلامی بینکوں میں رائج مراہجہ میں مطلوبہ سامان بینک کے پاس موجود نہیں ہوتا۔

✽ شرعی مراہجہ میں چونکہ تاجر نے سامان خریداری کے آرڈر یا وعدہ کے بغیر خریدا ہوتا ہے اس لیے وہ حالات کے رحم و کرم پر ہوتا ہے ممکن ہے گا ہک فوراً آجائے اور یہ فروخت ہو جائے اور یہ بھی احتمال ہے کہ اس کو طویل عرصہ تک انتظار کرنا پڑے اور یہ بھی خدشہ ہوتا ہے کہ اس عرصہ میں بازار میں چیز کی قیمت کم ہو جائے اور یہ نقصان اٹھا کر بیچنے پر مجبور ہو۔ اسلامی بینکوں میں رائج مراہجہ میں بینک کو یہ خطرات درپیش نہیں ہوتے۔

✽ شرعی مراہجہ ایک ہی مرحلہ میں مکمل ہو جاتا ہے۔ اس کے برخلاف اسلامی بینکوں میں مروجہ مراہجہ دو مرحلوں میں انجام پاتا ہے۔ پہلے مرحلہ میں وعدہ ہوتا ہے اور دوسرے مرحلہ میں عقد کی رسم ادا ہوتی ہے۔

✽ شرعی مراہجہ میں ادائیگی نقد بھی ہو سکتی ہے اور ادھار بھی لیکن بینکاری مراہجہ موجب ہی

ہوتا ہے۔ کیونکہ لوگ بینکوں میں جاتے ہی اس لیے ہیں کہ ان کے پاس رقوم نہیں ہوتیں۔

✽ شرعی مرابحہ کا معاملہ کرتے وقت سود فریقین کے وہم و خیال میں بھی نہیں ہوتا جبکہ اسلامی بینکوں میں نفع کا تعین ہی شرح سود سے ہوتا ہے۔

✽ شرعی مرابحہ میں صرف دو فریق ہوتے ہیں: (۱) بیچنے والا۔ (۲) خریدنے والا۔ اس کے برعکس یہاں ایک تیسرا فریق بینک بھی ہوتا ہے۔

مروجہ مرابحہ کا شرعی حکم:

یہ صورت چونکہ شرعی مرابحہ سے بالکل مختلف ہے اس لیے اس کو شرعی مرابحہ کی بنیاد پر جائز قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اس کا جواز اس بات پر موقوف ہے کہ یہ پوری طرح شرعی اصول سے ہم آہنگ ہے یا نہیں؟

جیسا کہ گزشتہ سطور میں بیان ہوا کہ مرابحہ کی بنیاد پر بیچی جانے والی چیز نہ تو پہلے سے بینک کے پاس موجود ہوتی ہے اور نہ ہی بینک براہ راست خریدتا ہے بلکہ وہ کلائنٹ سے کہتا ہے کہ آپ میرے ایجنٹ کی حیثیت سے یہ چیز خود خرید لیں۔ لہذا مناسب ہو گا کہ مرابحہ کی مختلف صورتوں کا الگ الگ حکم بیان کرنے سے قبل کلائنٹ کو وکیل بنانے کی شرعی حیثیت واضح کر دی جائے۔

کلائنٹ کے ذریعے خریداری کی شرعی حیثیت:

اس امر پر سب متفق ہیں کہ مرابحہ ایک جائز طریقہ تجارت تو ہے مگر یہ طریقہ تمویل نہیں ہے۔ لہذا اسے اس طرح انجام دینا کہ یہ عام بیچ کی بجائے سودی لین دین کا معاملہ نظر آئے درست نہیں۔ کلائنٹ کو خریداری کا ایجنٹ بنانے میں سودی لین دین کے ساتھ مشابہت بالکل واضح ہے اس لیے موجودہ اسلامی بینکوں کے حامی بھی اس کی اجازت نہیں دیتے۔ چنانچہ ”المعايير الشرعية“ میں ہے۔

((الأصل أن تشتري المؤسسة السلعة بنفسها مباشرة من البائع ويجوز لها تنفيذ ذلك عن طريق وكيل غير الأمر بالشراء ولا تلجأ لتوكيل العميل (الأمر بالشراء) إلا عند الحاجة الملحة)) [ص ۱۱۲]

”اصل یہ ہے کہ بینک فروخت کنندہ سے براہ راست خود سامان خریدے۔ اور بینک ایجنٹ کے ذریعے بھی خرید سکتا ہے مگر وہ ایجنٹ کلائنٹ کے علاوہ کوئی دوسرا ہونا چاہیے ناگزیر صورت کے علاوہ کلائنٹ کو ایجنٹ نہیں بنانا چاہیے۔“

اسلامی بینکاری کے لیے سرگرم عمل مولانا تقی عثمانی صاحب لکھتے ہیں۔

”کلائنٹ کو وکیل بنا دینا تا کہ وہ تمویل کار کی طرف سے اس چیز کو خرید لے مراہجہ کو مشتبہ بنا دیتا ہے اس وجہ سے بعض شریعہ بورڈز نے اس تکنیک کو ممنوع قرار دے دیا ہے۔“ [اسلامی بینکاری کی بنیادیں: ص 164]

طرفہ تماشایہ ہے کہ تقریباً تمام اسلامی بینک اسی تکنیک کو اختیار کیے ہوئے ہیں۔

اب ذیل میں شرعی اصول کی روشنی میں اس کی مختلف صورتوں کا الگ الگ حکم بیان

کیا جاتا ہے۔

پہلی صورت:

اس معاملہ کی پہلی صورت یہ ہے کہ بینک کیساتھ کیے ہوئے وعدہ کی پابندی فریقین کے لیے لازم ہو کہ بینک ہر صورت سامان دینے اور کلائنٹ خریدنے کا پابند تو یہ صورت عملاً بیچ ہی کی ہے جو شرعی اصول سے متصادم ہونے کی وجہ سے ناجائز ہے۔

چنانچہ ڈاکٹر شیخ محمد سلیمان الاشقر لکھتے ہیں:

((وإذا تم هذا فان الاتفاق في الحقيقة هو عقد لان ما فيه من اتفاق ارادتين على انشاء حق فهو عقد بلاريب ولو سمى وعدا فهو عقد ايضاً فاذا جرى الاتفاق على هذه الطريقة فهو

عقد باطل و حرام لا سباب)) [بحوث فقیہہ فی قضاء

اقتصادیہ معاصرہ: ج ۱ ص ۸۲]

”جب یہ معاملہ پورا ہو جائے تو یقیناً یہ ایگریمنٹ درحقیقت عقد ہے کیونکہ دو ارادوں کا ایک حق کو وجود میں لانے پر اتفاق بلاشبہ عقد ہے اگرچہ اسے وعدے کا نام بھی دیا جائے پھر بھی یہ عقد ہے جب ایگریمنٹ اس طریقے کے مطابق پورا ہو تو وہ چند اسباب کی بناء پر باطل اور حرام ہے۔“

وہ کون سے شرعی اسباب ہیں جن کی بنیاد پر یہ عقد حرام قرار پاتا ہے اس کی وضاحت میں شیخ اشقر فرماتے ہیں:

✽ اس کی حرمت کا پہلا سبب یہ ہے کہ بینک کلائنٹ کو ایک ایسی چیز بیچ رہا ہے جو ابھی تک اس کی ملکیت نہیں حالانکہ نبی ﷺ نے اس چیز کی بیع کی ممانعت فرمائی ہے جو قبضے میں نہ ہو۔ اور آپ ﷺ نے اس بیع سے بھی منع فرمایا ہے کہ ایسی چیز آگے بیچی جائے جو انسان کے پاس موجود نہ ہو۔

✽ بینک نے مُعَلَّق (Contingent) بیع کی ہے کیوں کہ کلائنٹ بینک سے یہ کہتا ہے کہ اگر تم اس کو خرید لو تو میں تم سے لے لوں گا جبکہ بیع معلق صحیح نہیں ہے۔

✽ اس کی حرمت کا تیسرا سبب یہ ہے کہ یہ سود پر قرض دینے کا حیلہ ہے۔

✽ اگر بیچی جانے والی چیز کا تعلق غذائی اشیاء سے ہو تو اس میں ممانعت کا چوتھا سبب بھی شامل ہو جاتا ہے۔ جس کی طرف ابن عبدالبر نے اشارہ کیا ہے کہ نبی ﷺ نے طعام کی بیع سے منع فرمایا حتیٰ کہ تاجر اسے اٹھا کر اپنے ٹھکانوں پر لے جائیں۔

[بحوث فقیہہ فی قضا یا اقتصادیہ معاصرہ: ج ۱ ص ۷۲۷۳]

علاوہ ازیں یہ آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد کے بھی مخالف ہے۔

((البیعان بالخیار مالم یتفرقا)) [صحیح بخاری: کتاب

البیوع، باب کم یجوز الخیار]

”الگ ہونے تک بائع مشتری دونوں کو اختیار ہوتا ہے۔“

لیکن بینک میں مروجہ مراہجہ میں یہ اختیار سلب کر لیا جاتا ہے۔

امام شافعی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

((وإذا أرى الرجل الرجل السعلة فقال اشتر هذه وأربحك فيها كذا فاشترها الرجل فالشراء جائز والذي قال أربحك فيها بالخيار إن شاء أحدث فيها بيعاً وإن شاء تركه وهكذا إن قال اشتر لي متاعاً ووصفه له أو متاعاً أي متاع شئت وأنا أربحك فيه فكل هذا سواء يجوز البيع الأول ويكون هذا فيما أعطى من نفسه بالخيار)) [كتاب الام: ج ۳ ص ۳۹]

”جب ایک شخص دوسرے کو کوئی چیز دکھا کر یہ کہے کہ یہ خرید لیں میں آپ کو اتنا منافع دوں گا اس پر وہ شخص وہ چیز خرید لے تو یہ خریداری جائز ہوگی۔ تاہم جس نے یہ کہا تھا کہ میں اتنا نفع دے دوں گا اس کو اختیار ہے اگر چاہے تو بیع کرے اور اگر چاہے تو چھوڑ دے۔ اور اسی طرح اگر یہ کہے کہ میرے لیے فلاں قسم کا سامان خرید لو یا یہ کہے کہ جو سامان تم چاہو وہ خرید لو میں آپ کو اس میں اتنا نفع دوں گا تو پہلی بیع جائز ہوگی اور آڈر دینے والے کو اختیار ہوگا۔“

مزید لکھتے ہیں:

((وإن تباعا به على أن ألزما أنفسهما الأمر الأول فهو مفسوخ من قبل شيئين أحدهما أنه تباعاه قبل يملكه البائع والثاني أنه على مخاطرة أنك إن اشتريته على كذا أربحك فيه كذا))

”اگر دونوں اس چیز کی اس طرح بیع کریں کہ وہ دونوں پہلے آڈر کو لازم سمجھیں تو یہ دو وجہ سے فسخ ہوگی۔

(۱) دونوں نے چیز ملکیت میں آنے سے پہلے بیع کی ہے۔

(۲) اس میں غرر ہے کیونکہ اس نے کہا ہے کہ اگر آپ اتنے کی خرید لیں تو میں آپ کو اتنا نفع دوں گا۔ [حوالہ مذکورہ]

نیز یہ بیع الکالی بالکالی کی قبیل سے ہے کیونکہ بینک نے سامان بعد میں دینا ہے۔ اور کلائنٹ نے قیمت بعد میں ادا کرنی ہے۔ شرعی طور پر یہ بھی ممنوع ہے۔

((أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهَى عَنْ بَيْعِ الْكَالِيِّ))

[سنن دارقطنی: ۳۱۰۵]

”بلاشبہ نبی ﷺ نے ادھار کے بدلے ادھار بیع سے منع فرمایا ہے۔“

امام شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ روایت تو ضعیف ہے لیکن اس مسئلہ پر اجماع ہے کہ

ادھار کی ادھار کے بدلے بیع جائز نہیں۔ [نیل الاوطار: ج ۸، ص ۲۱۳]

مالکی فقہاء نے مکروہ بیع کی ایک صورت یہ بھی ذکر کی ہے کہ آدمی کسی دوسرے سے یہ کہے:

”کیا آپ کے پاس فلاں فلاں چیز ہے جو آپ مجھے ادھار بیچ دیں؟ وہ جواب دے کہ نہیں اس پر یہ کہے کہ آپ یہ خرید لیں میں آپ سے منافع پر ادھار خرید لوں گا اس پر وہ چیز خرید کر اپنے وعدے کے مطابق بیچ دے۔“ [الموسوعة الفقهية الكويتية

بحوالہ مواجب الجلیل للحطاب البیان والتحصيل لابن رشد]

اسلامی بینک کاری کے ماہر ڈاکٹر رفیق یونس مصری لکھتے ہیں:

((فاذا لم يكن هناك خيار فانها لا تجوز لان المواعدة

الملزمة في بيع المرابحة تشبه البيع نفسه حيث يشترط

عندئذ ان يكون البائع مالكا للمبيع حتى لا تكون هناك

مخالفة لنهي النبي ان يبيع الانسان ما ليس عنده فالمرابحة

ظاهرها البيع وباطنها التمويل فانها لا تجوز))

[المصارف الاسلامية: ص ۳۳]



”جب اختیار نہ ہو تو معاملہ جائز نہیں کیوں کہ بیع مراہمہ میں لازمی وعدہ نفس بیع کے مشابہہ ہے جب بیع میں یہ شرط ہے کہ فروخت کنندہ بیچی جانے والی چیز کا مالک ہو۔ تو نبی ﷺ کہ اس فرمان کہ ”جو انسان کے پاس نہیں وہ بیچنا منع ہے۔“ کی مخالفت نہ ہو۔ چنانچہ وعدہ غیر لازمی ہو تو مراہمہ جائز ہے لیکن جب مراہمہ کا ظاہری مطلب بیع ہو اور حقیقت میں فنا سنگ ہو تو یہ جائز نہیں۔“

شیخ بکر بن عبداللہ ابوزید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

((فكيف يجوز للمصرف ان يبيع ما لم يملك اصلاً و يوافق و يربح فيه فملكه تقديري لا حقيقي استيلاءه عليه تقديري لا حقيقي فالمنع من هذا يكون باب الاولى))

[فقہ النوازل : ج ۲، ص ۹۳]

”بینک کے لیے یہ کیسے جائز ہے کہ وہ ایک ایسی چیز بیچے کہ جس کا وہ بالکل ہی مالک نہیں ہے وہ سودا حاصل کر کے نفع حاصل کرتا ہے حالانکہ وہ چیز اسکی تقدیری ملکیت میں ہے نہ کہ حقیقی۔ چنانچہ اس کی ممانعت بدرجہ اولیٰ ہونی چاہیے۔“

ڈاکٹر احمد ریان لکھتے ہیں:

((هذا العقد تكتفه مجموعة من المحاذير الفقهية التي من أهمها: ان الوعد من العميل بالشراء، وموافقة المصرف على ذلك؛ هو عقد حتى وان كتب في الاوراق انه وعد، لان العبرة بالمعاني وليست بالمباني كما يقول الفقهاء، وبما انه عقد فيشترط له توفر كافة شروط عقد البيع، واكثرها غير متوفرة فيه)) [فقہ البيوع المنهى عنها مع تطبيقاتها الحديثة في المصارف الاسلامية: ص ۴۴]

”اس معاملہ کو متعدد فقہی خرابیوں نے گھیرا ہوا ہے ان میں سے سب سے اہم یہ ہے کہ کلائنٹ کی طرف سے خریداری کا وعدہ اور بینک کی اس پر موافقت معاہدہ

ہے۔ اگرچہ کاغذات میں اس کو وعدہ لکھا جاتا ہے۔ کیونکہ فقہاء کے قول کے مطابق حقائق کا اعتبار کیا جاتا ہے نہ کہ الفاظ کا۔ اور جب یہ معاہدہ ہے تو اس میں معاہدہ بیع کی تمام شرطوں کا پایا جانا ضروری ہے اور ان میں سے اکثر یہاں نہیں پائی جاتیں۔“

یہاں یہ بات بھی ذہن میں رکھیے کہ اس میں منافع کے لیے شرح سود کو معیار بنانے سے یہ معاملہ مزید مشکوک ہو جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ اسلامی بینکاری کے حامی بھی اس کو پسندیدہ قرار نہیں دیتے چنانچہ مولانا تقی عثمانی صاحب لکھتے ہیں:

”اس میں کوئی شک نہیں کہ حلال منافع کے تعین کے لیے سود کی شرح کا استعمال پسندیدہ نہیں اور اس سے یہ معاملہ کم از کم ظاہری طور پر سودی قرض کے مشابہ بن جاتا ہے اور سود کی شدید حرمت کے پیش نظر اس ظاہری مشابہت سے بھی جہاں تک ہو سکے بچنا چاہیے۔“ [اسلامی بینکاری کی بنیادیں: ص ۱۲۳]

مزید لکھتے ہیں:

”البتہ یہ بات درست ہے کہ اسلامی بینکوں اور مالیاتی اداروں کو جتنا جلدی ممکن ہو اس طریقہ کار سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہیے۔ اس طرح کہ اول تو اس میں شرح سود کو حلال کاروبار کے لیے مثالی اور معیاری سمجھ لیا جاتا ہے جو کہ پسندیدہ بات نہیں دوسرا اس لیے کہ اس سے اسلامی معیشت کے بنیادی فلسفے کو فروغ نہیں ملتا۔ اس لیے کہ اس سے تقسیم دولت کے نظام پر کوئی اثر مرتب نہیں ہوتا۔“ [اسلامی بینکاری کی بنیادیں: ص ۱۲۵]

دوسری صورت:

اس معاملے کی دوسری صورت یہ ہے کہ وعدہ ایک طرفہ ہو یعنی گاہک اپنے وعدے کا پابند ہو لیکن بینک آزاد ہو یہ صورت بھی درست نہیں کیونکہ نبی ﷺ کے ارشاد ”البيعان بالخيار“ میں بیچنے والے خریدنے والے دونوں کو اختیار دیا گیا ہے ایک کو پابند اور

دوسرے کو مستثنیٰ رکھنا اس تفریق کی کوئی اصل نہیں چنانچہ ڈاکٹر رفیق یونس مصری لکھتے ہیں:

(( انی اری ضرورة الخيار لكلا المتواعدين اما الخيار لاحدهما

فقط فهو تحکم )) [تعلیق مصارف الاسلامیة: ص ۳۲]

”میری رائے میں دونوں کو اختیار ضروری ہے فقط ایک کو اختیار سینہ زوری ہے۔“

تیسری صورت:

اس معاملے کی تیسری صورت یہ ہے کہ کلائنٹ اور بینک دونوں پابند نہ ہوں بینک کے چیز خریدنے کے بعد کلائنٹ کو بیع کرنے اور نہ کرنے دونوں کا اختیار ہو اس طرح بینک بھی اپنے فیصلے میں آزاد ہو تو یہ صورت جائز ہوگی بشرطیکہ بینک نے وہ چیز کلائنٹ کے ذریعے نہ خریدی ہو اور نفع کے لیے شرح سود کو معیار بھی نہ بنایا گیا ہو کیونکہ اس طرح یہ معاملہ سودی قرض کے مشابہ بن جاتا ہے۔

اس موقع پر ڈاکٹر محمد سلیمان اشقر کے فتویٰ کا ذکر بھی مفید رہے گا۔

(( نظام البيع المرابحة كما تجر به بعض البنوك الاسلامية في

الوقت الرهن نظام غير جائز وهو تحايل على الربا او هو بيع

السلعة من البنك قبل امتلاكها وكلاهما ممنوع شرعاً

والسنة النبوية تمنع هذا البيع وان المذاهب الاربعة كلها

تقول بانه ومحرم وخاصة مذهب المالكية الذي ينص نصاً

صريحاً على منعه والذين قالوا في مؤتمر البنك الاسلامي

بدبي بجوازه غلطوا على الفقه الاسلامي غلطاً كبيراً وانه لا

مستند لهم في ما قالوا ))

[بحوث فقیہہ فی قضایا اقتصادی معاصرہ: ج ۱ ص ۱۱۳، ۱۱۵]

”بیع مرابحہ کا نظام جس کو دور حاضر میں بعض اسلامی بینک جاری کیے ہوئے ہیں

نا جائز ہے اور یہ سود کے حاصل کرنے کا حیلہ ہے یا یہ بینک کی طرف سے ایسی چیز کی

بیع ہے جو ابھی اس کی ملکیت میں نہیں آئی اور دونوں شرعاً ممنوع ہیں اور سنت نبوی ﷺ اس بیع کی اجازت نہیں دیتی بلاشبہ مذہب اربعہ اس کو حرام قرار دیتے ہیں خاص طور پر مالکیوں کا مذہب جس نے اس ممانعت کی واضح طور پر صراحت کی ہے اور جنھوں نے دوہی میں اسلامی بینک کی کانفرنس میں اس کو جائز قرار دیا۔ انھوں نے فقہ اسلامی کے ذمے بہت بڑی غلطی لگائی اور ان کے پاس اپنی تائید میں کوئی دلیل نہیں ہے۔“

اسلامی بینکوں کا نقطہ نظر:

اسلامی بینکوں کی طرف سے اس کے حق میں سب سے بڑی دلیل یہ پیش کی جاتی ہے کہ حقیقی بیع تب ہوتی ہے جب بینک مطلوبہ سامان خرید لیتا ہے اس سے پہلے صرف بیع کا وعدہ ہوتا ہے۔ لہذا اس سے اوپر بیان شدہ خرابیاں لازم نہیں آتیں۔ بیع اور وعدہ میں فرق ہے مثلاً بینک کی طرف سے مطلوبہ چیز خریدنے کے بعد اور کلائنٹ کے حوالے کرنے سے پہلے اگر وہ ضائع ہو جائے تو بینک کا نقصان ہوگا اسی طرح اگر بینک کی طرف سے خریداری کے بعد کلائنٹ انکار کر دے تو بینک اس کو کسی دوسرے شخص کو بیچ کر الگ لاگت سے جتنے پیسے کم ملیں گے وہ وعدہ کرنے والے سے وصول کرے گا۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ باقاعدہ بیع نہیں ہے ورنہ نہ تو بینک نقصان کا ضامن ہوتا اور نہ ہی اس کو دوسری جگہ بیچنے کا اختیار ہوتا لیکن اگر غور کیا جائے تو دو وجہ سے یہ دلیل انتہائی کمزور ہے۔

۱۔ ہم پیچھے بیان کر آئے ہیں کہ لازمی وعدہ بیع ہی کی شکل ہے یہی وجہ ہے کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور مالکی فقہاء نے ”مرا بحة للامر بالشراء“ کی جس شکل میں اختیار نہ ہو کونا جائز قرار دیا ہے جیسا کہ اوپر بیان ہوا ہے۔

فقہائے احناف کے سرخیل حضرت امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے اس خطرہ کے پیش نظر کہ ”آرڈر دینے والا خریدنے سے انکار نہ کرے کے لیے یہ حیلہ تجویز کیا ہے کہ جس کو آرڈر دیا گیا ہے وہ اس شرط پر خریدے کہ مجھے تین دن بعد واپس کرنے کا

اختیار ہے اگر آرڈر دینے والا اپنے وعدے کے مطابق خرید لے تو اس کے حوالے کر دے۔ اگر اس کو دلچسپی نہ ہو تو اس اختیار کی بناء پر واپس کر کے نقصان سے محفوظ رہے گا۔ [کتاب الحیل امام محمد بحوالہ بحوث فقیہة فی قضایا

اقتصادية معاصرة: ج ۱ ص ۱۰۲، ۱۰۳]

یہ اس بات کی صریح دلیل ہے کہ فقہاء احناف کے ہاں مراہجہ میں وعدہ پورا کرنا قانونی ذمہ داری نہیں ورنہ اس حیلے کی ضرورت پیش نہ آتی۔

باقی رہ گیا وہ فرق جو اسلامی بینکوں کی جانب سے بیان کیا جاتا ہے تو اس سے معاملے کی حقیقت پر کوئی اثر نہیں پڑتا کیونکہ دونوں صورتوں میں نتیجہ ایک ہے وہ یہ کہ فریقین وعدے کے مطابق بیع کرنے کے پابند ہیں۔

۲۔ اس دلیل کی کمزوری کی دوسری وجہ یہ ہے کہ جن آئمہ نے ایفائے وعدہ کو فرض کہا ہے۔ وہ تبرعات کے بارہ میں ہے نہ کہ معاوضات میں۔ بعض دفعہ یہ بھی ہوتا ہے کہ مشتری چیز خرید کر بل بینک کے حوالے کرتا ہے بینک کا کام صرف یہ ہوتا ہے کہ اس میں درج رقم ادا کر کے اس پر نفع وصول کرے۔ اس کو مراہجہ کا نام دے دیا جاتا ہے حالانکہ اس کا مراہجہ سے کوئی تعلق نہیں بلکہ یہ سراسر سودی حیلہ ہے۔

مذکورہ بالا تفصیل سے واضح ہوا کہ اسلامی بینکوں میں رائج مراہجہ شرعی اصول سے متصادم ہونے کی وجہ سے ناجائز ہے۔ اس لیے بیع مراہجہ کی بنیاد پر اسلامی بینکاری کا نظریہ دم توڑ رہا ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر رفیق یونس مصری لکھتے ہیں:

((وتجدد الاشارة الى ان نجم بيع المرابحة للامر بالشراء عند

الافراد والعلماء والهيئات والمجامع آخذ في الاخمال بل

ان بعض العلماء كالشيخ مصطفى الزرقاء قد غير رأيه تغيراً

جذرياً كما اعلن ذلك يوم الخميس)) [۹۱۷-۱۴۱۴ فی

ندوة البركة، ص: ۳۳]

”یہاں اس بات کی طرف اشارہ بھی مناسب رہے گا کہ ماہرین علماء اور مختلف کونسلوں اور اکیڈمیوں کے نزدیک خریداری کا آرڈر دینے والے کیساتھ بیع مراحہ کا معاملہ کرنے کا ستارہ ڈوب رہا ہے۔ بلکہ بعض علماء نے جیسا کہ شیخ محمد مصطفیٰ زرقاء ہیں کلیتاً اپنی رائے کو تبدیل کر لیا ہے جیسا کہ انہوں نے ۱۴۱۴ھ - ۰۹ - ۰۷ بروز جمعرات برکہ سیمینار میں اعلان کیا۔“

اجارہ مُنتَهِيَةٌ بِالتَّمْلِيكِ:

یہ بھی اسلامی بینکوں میں فنانسنگ کا ایک بڑا ذریعہ ہے۔ اجارہ کی یہ صورت اسلامی بینکاری کی ایجاد کردہ ہے۔ ہمارے واجب الاحترام محدثین و فقہاء اس سے واقف نہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی کتب میں اس کا ذکر نہیں ملتا۔ لہذا ہم بھی اس کے احکام جاننے کے لیے اسلامی بینکوں کی رہنمائی کے لیے مرتب کردہ شریعہ سٹینڈرڈز پر ہی اعتماد کریں گے۔ چنانچہ شریعہ سٹینڈرڈز کے سکالرز نے اس کی تعریف یوں کی ہے۔

((ہی اجارة يقترن بها الوعد بتملك العين الموجهة الى المستأجر في نهاية مدة الاجارة اوفى اثنائها))

[المعايير الشرعية: ص ۱۵۳]

”ایسا اجارہ جس میں یہ وعدہ شامل ہو کہ مدت اجارہ کے آخر میں یا اس کے دوران ہی کرائے پردی گئی چیز کی ملکیت کرایہ دار کی طرف منتقل کر دی جائے گی۔“

ڈاکٹر وہبہ زحیلی رحمۃ اللہ علیہا لکھتے ہیں:

((ہی تملك منفعة بعض الاعيان كالدور والمعدات مدة معينة من الزمن باجرة معلومة تزيد عادة عن اجرة المثل وعلى ان يملك الموجه العين الموجهة للمستأجر بناء على وعد سابق بتملكها في نهاية المدة او في اثنائها بعد سداد جميع مستحقات الاجرة او اقساطها وذلك بعقد جديد))

[المعاملات المالية المعاصرة: ص ۳۹۴]

”اجارہ منتھیة بالتملیک کا مطلب ہے کہ متعین وقت کے لیے طے شدہ کرائے جو عام طور پر اس طرح کی دوسری چیزوں کے کرائے سے زیادہ ہوتا ہے کے بدلے کسی چیز جیسے گھریا سامان کے فائدے کا دوسرے کو مالک بنا دینا اس شرط پر کہ کرایہ کی تمام قسطیں ادا کرنے کے بعد مدت کرایہ کے اختتام پر یا اس کے دوران ہی مالک سابق وعدے کی بنیاد پر ایک نئے عقد کے ذریعے اس چیز کی ملکیت کرایہ دار کی طرف منتقل کر دے گا۔“

شرعی اجارہ اس سے مختلف ہے۔ اسلامی بینکاری کے حامی بھی اس بات کے قائل ہیں کہ شریعت نے اجارہ کا جو تصور دیا ہے وہ اس سے مختلف ہے چنانچہ ڈاکٹر وہبہ زحیلی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: اجارہ ”منتھیة بالتملیک“ عام اجارہ سے دو لحاظ سے مختلف ہے:

۱۔ اجارہ ”منتھیة بالتملیک“ دو معاہدوں پر مشتمل ہوتا ہے۔

✽ اجارہ کا معاہدہ جو طے شدہ مدت تک جاری رہتا ہے۔

✽ مدت کے اختتام یا دوران مدت اس چیز کا مالک بنانے کا معاہدہ۔

۲۔ اجارہ ”منتھیة بالتملیک“ میں بینک کرائے پردی جانے والی چیز کلائنٹ کی درخواست کے بعد خریدتا ہے اکثر اس کا کرایہ عام کرائے سے زیادہ ہوتا ہے جبکہ عام اجارہ میں وہ چیز پہلے سے موجر کے پاس موجود ہوتی ہے۔ [المعاملات المالية المعاصرة وہبہ زحیلی: ص ۳۹۵]

اسلامی بینکوں میں رائج اجارہ اور سودی بینکوں میں رائج ہائر پر چیز میں فرق:

اسلامی بینکوں کے نقطہ نظر کے مطابق دونوں میں فرق اس طرح ہے کہ ہائر پر چیز میں بیع اور اجارہ دونوں بیک وقت شروع ہوتے ہیں اور آخری قسط کی ادائیگی پر از سر نو معاہدہ کیے بغیر ہی چیز کی ملکیت مستاجر کی طرف منتقل ہو جاتی ہے جبکہ اجارہ منتھیة بالتملیک میں مدت اجارہ کے ختم ہونے تک اجارہ کے احکام نافذ ہوتے ہیں اسکے بعد ملکیت مستاجر کی طرف منتقل ہوتی ہے۔ [المعايير الشرعية: ۱۴۶]

اسی طرح اجارہ "منتھية بالتملك" اور بیع قسط میں بھی فرق ہے۔ بیع قسط میں چیز کی ملکیت فوری طور پر خریدار کی طرف منتقل ہو جاتی ہے صرف قیمت قسطوں میں ادا کی جاتی ہے جبکہ مذکورہ بالا اجارہ میں دو معاہدے جمع ہوتے ہیں۔

① اجارہ کا معاہدہ۔

② مدت پوری ہونے پر بیع کا معاملہ۔ [المعاملات المالية المعاصرة للدكتور

وهبة الزحيلي: ۳۹۵، ۳۹۶]

ملکیت منتقل ہونے کے طریقے:

"المعايير الشرعية" میں اس کی تین صورتیں بیان ہوئی ہیں۔

۱۔ رسمی یا حقیقی قیمت کے بدلے بیع کا وعدہ ہو یا مدت اجارہ کے دوران ہی باقی مدت کے کرائے کے بدلے یا مارکیٹ ریٹ کے مطابق بیع کا وعدہ ہو۔

۲۔ ہبہ کا وعدہ ہو۔

۳۔ ہبہ کا معاہدہ ہو جو تمام اقساط کی ادائیگی کے ساتھ مشروط ہو۔ [ص ۱۴۱]

البتہ یہ فیصلہ کرنا شروع میں ضروری ہے کہ کون سا طریقہ اختیار کیا جائیگا۔

المعايير الشرعية میں یہ بھی صراحت ہے کہ یہ وعدہ موجر (بینک) کی طرف سے ہو

گا۔ مزید لکھا ہے کہ یہ وعدہ یک طرفہ ہوگا اور موجر (بینک) پر اس کی پابندی لازم

ہوگی۔ [ص ۱۴۲]

یہاں اس امر کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ بینک جس چیز پر اجارہ کرتا ہے وہ پہلے

سے بینک کے پاس موجود نہیں ہوتی بلکہ وہ کلائنٹ کی درخواست پر خریدی جاتی ہے۔ اس

میں یہ امکان بھی ہوتا ہے کہ بینک جب وہ چیز خرید لے تو کلائنٹ لینے سے انکار کر

دے۔ ظاہر ہے بینک اس کا متحمل نہیں ہو سکتا چنانچہ اسلامی بینکوں نے اس خطرے کا یہ

حل نکالا ہے کہ کلائنٹ سے متعلقہ چیز کی قیمت کا دس فیصد پہلے وصول کر لیا جائے اس کو

"ضمان جديہ" کہا جاتا ہے۔ اگر کلائنٹ بینک کی خریداری کے بعد اپنی بابت پر قائم



نہ رہے تو بینک اس کا معاملہ کسی دوسرے کے ساتھ کرے گا اور جتنا نقصان ہوگا وہ ”ضمانِ جَدِيَّه“ سے پورا کرے گا۔ اگر ضمانِ جَدِيَّه نقصان کی تلافی کے لیے ناکافی ہو تو وہ کلائنٹ سے مزید مطالبہ بھی کر سکتا ہے کیونکہ بینک کو یہ نقصان اس کی وجہ سے ہوا ہے اگر ضمانِ جَدِيَّه سے نقصان پورا کرنے کے بعد کچھ رقم بچ جائے (جو ممکن نہیں) تو وہ کلائنٹ کی ہوگی۔ شرعی اجارہ میں یہ نہیں ہوتا۔ شرعی اجارہ میں مالک نے چونکہ وہ چیز کسی درخواست کے بغیر خریدی ہوتی ہے اس لیے اس میں دونوں احتمال ہوتے ہیں کہ کوئی کرایہ پر لینے کے لیے آجائے یا نہ آئے۔ اس سے بھی ہمارے اس موقف کو تقویت ملتی ہے کہ اسلامی بینک نان رسک ادارہ ہے۔

### ضمانِ جَدِيَّه کی شرعی حیثیت:

”المعايير الشرعية“ کے نقطہ نظر کے مطابق یہ رقم یا تو بینک کے پاس حفاظت کی غرض سے رکھی گئی امانت تصور ہوگی بینک اس میں تصرف کا مجاز نہیں ہوگا یا اسکی حیثیت اس امانت کی ہوگی جو سرمایہ کاری کے لیے دی جاتی ہے یعنی کلائنٹ بینک کو اجازت دے گا کہ وہ اس رقم سے مضاربہ کی بنیاد پر سرمایہ کاری کرے اور یہ بھی جائز ہے کہ جب اجارہ کا باقاعدہ عقد ہو اس وقت یہ طے کر لیا جائے کہ یہ رقم اجرت کی قسطوں میں شمار ہوگی۔ [ص ۱۳۴]

ہماری ناقص رائے میں ”ضمانِ جَدِيَّه“ کو امانت قرار دینا درست نہیں کیونکہ امانت تصرف میں نہیں لائی جاسکتی اور مالک جب چاہے اپنی امانت واپس لے سکتا ہے اس کے برعکس اسلامی بینک اس رقم کو استعمال بھی کرتے ہیں اور مالک کی حسب منشاء واپسی کی پابندی بھی قبول نہیں کرتے۔

اگر چیز تباہ ہو جائے یا قابل استعمال نہ رہے؟

اس بارے میں شریعہ سٹینڈرڈز کا موقف بڑا واضح ہے کہ اگر اس میں مستاجر کا عمل دخل نہ ہو تو دونوں حالتوں میں اجرتِ مثل (مارکیٹ کرایہ) کی طرف لوٹا جائے

گا۔ اور عقد میں طے شدہ کرایہ کے مطابق بینک نے اجرت مثل سے جتنا زیادہ لیا ہوگا وہ مستاجر کو واپس کرنے کا پابند ہوگا۔ [ص ۱۴۲]

اجارہ ”منتھية بالتملك“ کا شرعی حکم:

ڈاکٹر احمد ریان اسلامی بینکوں میں رائج اجارہ کی مروجہ صورتوں میں پائی جانے والی خرابیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

✽ اس میں بیع معلق (Contingent) ہوتی ہے یہ ایسی خرابی ہے جس کی ممانعت پر تمام فقہاء متفق ہیں۔

✽ اس میں شرط پائی جا رہی ہے بعض فقہاء کے نزدیک یہ بھی ممنوع ہے۔

✽ ایک Contract میں دو معاملے جمع ہو رہے ہیں یعنی ایک بیع میں دو بیعوں کی

ممانعت داخل ہے۔ [فقہ البيوع المنهي عنها مع تطبيقاتها الحديثة في

المصارف الاسلامية]

علاوہ ازیں اس میں حسب ذیل خرابیاں بھی پائی جاتی ہیں:

✽ جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ معاہدے کے شروع میں بینک یہ وعدہ کرتا ہے

کہ مدت اجارہ ختم ہونے پر رسی یا حقیقی قیمت کے عوض یا مدت اجارہ کے دوران ہی

باقی قسطوں کے بدلے یا بازاری قیمت پر یہ چیز مستاجر کی ملکیت میں دے دے گا۔

ڈاکٹر محمد زحیلی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

((اما ان كان الوعد ملزما فيدخل في معاملات محرمة شرعا

وهي بيع ما لا يملك والبيع قبل القبض بل قبل الشراء))

[المصارف الاسلامية: ص ۷۷، ۷۸]

”اگر وعدہ لازمی ہو تو یہ شرعی طور پر حرام معاملات میں داخل ہو جائے گا۔ وہ ہے غیر

ملکیتی چیز اور قبضہ سے پہلے بلکہ خریدنے سے پہلے ہی بیع کا معاملہ۔“

یا یہ ہبہ کا وعدہ ہوتا ہے۔ یا پھر ہبہ کا ایسا معاہدہ ہوتا ہے جو تمام اقساط کی ادائیگی کے ساتھ مشروط ہوتا ہے۔ جو صورت بھی ہو وہ غرر سے خالی نہیں۔ کیونکہ ایسا وعدہ بیع جس کی پابندی لازم ہو عملاً بیع ہی ہے۔ اسلامی بینکنگ کے حامیوں کا یہ کہنا کہ یہ یکطرفہ وعدہ ہے جس میں ایک فریق کو اختیار ہے تو بقول ڈاکٹر رفیق یونس مصری کے صرف ایک کو اختیار دینا سینہ زوری ہے۔ جب یہ بیع ہی ہے تو بیع کا معاہدہ طے پاتے وقت قیمت مجہول ہوئی کیا علم پانچ سال بعد حقیقی قیمت کیا ہوگی یا رسمی قیمت کیا مقرر ہوگی۔ اور یہ بھی احتمال ہوتا ہے کہ مستاجر مکمل قسطیں ادا نہ کر سکنے کی وجہ سے اس کے ملکیتی حقوق حاصل نہ کر سکے۔

اس کو ہبہ کہنا بھی درست نہیں کیونکہ مستقبل کی شرط پر موقوف ہبہ درست نہیں ہوتا جیسا کہ شیخ صالح بن فوزان رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

((ولا تصح الهبة المعلقة على شرط مستقبل كان يقول اذا

حصل كذا فقد وهبتك كذا)) [الملخص الفقہی: ۲ ص، ۱۱۵]

”مستقبل کی شرط پر موقوف ہبہ صحیح نہیں ہے جیسے یہ کہے کہ جب اس قسم کی چیز حاصل ہوگی تو میں فلاں چیز آپ کو ہبہ کر دوں گا۔“

ایسے ہی اس کو ہبہ کا وعدہ کہنا بھی درست نہیں کیونکہ اس صورت میں یہ ایسا ہبہ ہوگا کہ مارکیٹ ریٹ سے زیادہ کرایہ وصول کرنے کی صورت میں جس کا بدلہ لیا جانا ہے۔ اس قسم کا ہبہ بھی بیع ہی کے حکم میں ہوتا ہے سوائے اس کے کہ اس میں معاوضہ اور اس کی مقدار طے نہیں ہوتی۔

✽ اس کی عملی تطبیق میں بھی گڑبڑ ہوتی ہے وہ یوں کہ بینک اس مدت کا کرایہ بھی قسطوں میں ایڈجسٹ کرتا ہے جس میں گاڑی تو کلائنٹ کو نہیں ملی ہوتی لیکن بینک رقم جمع کروا چکا ہوتا ہے جیسا کہ ہم پیچھے اسلامی بینکاری کے سکالر جناب محمد ایوب کے حوالے سے لکھ آئے ہیں۔

- \* اس میں شریعہ سٹینڈرڈز کے احکام کی بھی خلاف ورزی پائی جاتی ہے۔
- \* شریعہ سٹینڈرڈز کے مطابق بیج کا وعدہ بینک کی جانب سے ہونا چاہیے جبکہ اسلامی بینک کلائنٹ سے وعدہ لیتے ہیں۔
- \* شریعہ سٹینڈرڈز کے مطابق بینک ”ضمان جدیدہ“ سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا جبکہ اسلامی بینک اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔
- \* شریعہ سٹینڈرڈز کی رائے میں اجارہ پردی ہوئی چیز اگر تباہ ہو جائے یا وہ باقی ماندہ مدت کے لیے قابل استعمال نہ رہے بشرطیکہ اس میں مستاجر کا عمل دخل نہ ہو تو بازاری قیمت سے زائد لیا ہوا کرایہ مستاجر کو واپس کیا جانا چاہیے لیکن اسلامی بینکوں میں اس پر عمل نہیں ہوتا بلکہ ان کا طریقہ یہ ہے کہ انشورنس یا تکافل کمپنی سے جو رقم ملتی ہے اس میں سے پہلے اپنی باقی ماندہ رقم پوری کرتے ہیں۔ اگر کچھ بچ جائے تو مستاجر کو دیتے ہیں ورنہ اللہ اللہ خیر سلا۔
- اسلامی بینکوں کا یہ عمل سراسر غیر اسلامی اور انکے اپنے ہی شریعہ سٹینڈرڈز کے خلاف ہے۔

### مشارکہ متناقصہ (Diminishing Musharakah):

اس کو شرکہ متناقصہ بھی کہتے ہیں اس کا معنی ہے تخفیف پذیر مشارکہ یعنی وہ مشارکہ جس میں ایک فریق اپنا حصہ وقفے وقفے سے دوسرے فریق کو بیچتا جاتا ہے بالآخر دوسرا فریق کلی طور پر اثاثے کا مالک بن جاتا ہے۔ اسلامی بینکوں میں اس پر بھی بکثرت عمل ہوتا ہے اس کو زیادہ تر ہاؤس فنانسنگ کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ اجارہ ”منتھیة بالتملیک“ کی طرح یہ اصطلاح بھی اسلامی بینکاری نے ہی متعارف کروائی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کا سب سے پہلے استعمال مصر میں شروع ہوا۔ [المعاملات المالیه المعاصره للدکور محمد عثمان شبیر: ص ۳۳۹]

ظاہر ہے جب ذخیرہ حدیث و فقہ میں اس اصطلاح کا ذکر ہی نہیں تو ہمیں اسکی

حقیقت جاننے کے لیے اسلامی بینکنگ کے ماہرین کی طرف ہی رجوع کرنا پڑے گا۔ چنانچہ المعاییر الشرعیۃ میں اسکی تعریف یوں بیان ہوئی ہے۔

((المشاركة المتناقصة عبارة من شركة يتعهد فيها احد الشركاء بشراء حصة الآخر تدريجاً الى ان يملك المشتري المشروع بكامله)) [ایضاً۔ ص ۲۰۶]

”مشارکہ متناقصہ ایسی شرکت سے عبارت ہے جس میں ایک شریک یہ عہد کرتا ہے کہ وہ آہستہ آہستہ دوسرے شریک کا حصہ خرید لے گا یہاں تک کہ مشتری پورے منصوبے کا مالک ہو جائے۔“

اسکی عملی تطبیق کیا ہوتی ہے؟ یہ سمجھنے کے لیے ہم جناب مولانا تقی عثمانی صاحب کی کتاب ”اسلامی بینکاری کی بنیادیں“ سے ایک اقتباس نقل کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

”مشارکہ کی ایک اور شکل جسے ماضی قریب میں ترقی دی گئی ہے ”مشارکہ متناقصہ“ ہے۔ اس تصور کے مطابق ایک تمویل کار اور اس کا عمیل کسی جائیداد، سامان یا کاروباری ادارے کی مشترکہ ملکیت حاصل کرتے ہیں۔ تمویل کار کا حصہ کئی یونٹس میں تقسیم کر لیا جاتا ہے اور یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ عمیل تمویل کار کے حصے کے کئی یونٹس ایک ایک کر کے کچھ وقفوں کے بعد خرید لے گا جسکے نتیجے میں اس کا حصہ کم ہوتا رہے گا۔ یہاں تک کہ اس کے تمام یونٹس عمیل خرید لے گا اور جائیداد یا کاروباری ادارے کا تنہا مالک بن جائے گا۔“

شرکت متناقصہ کے اس تصور کو مختلف معاملوں میں مختلف طریقوں سے اختیار کیا جاتا ہے۔ چند نمونے ذیل میں دیے جاتے ہیں۔

اسے عام طور پر ہاؤس فنانسنگ کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ عمیل ایک گھر خریدنا چاہتا ہے جس کے لیے اس کے پاس کافی رقم موجود نہیں ہے۔ یہ ایک تمویل کار

کے پاس جاتا ہے جو اس کے ساتھ مل کر ایک گھر خریدنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ قیمت کا بیس فیصد عمیل ادا کرتا ہے اور اسی فیصد تمویل کار، لہذا گھر کے اسی فیصد حصے کا مالک تمویل کار ہے اور بیس فیصد کا عمیل، جائیداد کو مشترکہ خریدنے کے بعد عمیل گھر کو اپنی رہائشی ضرورتوں کے لیے استعمال کرتا ہے اور تمویل کار کو جائیداد میں اس کا حصہ استعمال کرنے کی وجہ سے کرایہ ادا کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ تمویل کار کے حصے کو آٹھ برابر یونٹس میں تقسیم کر لیا جاتا ہے۔ ہر یونٹ گھر کے دس فیصد ملکیت کی نمائندگی کرتا ہے۔ (کیونکہ اس کی کل ملکیت اسی فیصد تھی) عمیل، تمویل کار سے یہ وعدہ کرتا ہے کہ ہر تین ماہ بعد ایک یونٹ خریدے گا۔ چنانچہ تین ماہ کی پہلی مدت پوری ہونے پر وہ گھر کی قیمت کا دس فیصد حصہ ادا کر کے ایک یونٹ خرید لیتا ہے۔ اس سے تمویل کار کا ایک حصہ اسی فیصد سے کم ہو کر ستر فیصد ہو جائے گا۔ تمویل کار کا ادا کیا جانے والا کرایہ بھی اس قدر کم ہو جائے گا۔ دوسری مدت کے پورا ہونے کے بعد ایک اور یونٹ خریدے گا جس سے جائیداد میں اس کا حصہ بڑھ کر چالیس فیصد ہو جائیگا اور تمویل کار کا کم ہو کر ساٹھ فیصد رہ جائے گا اور اسی تناسب سے کرایہ بھی کم ہو جائے گا۔ یہ ترتیب اسی طریقے سے چلتی رہے گی یہاں تک کہ دو سال کے اختتام پر عمیل تمویل کار کا سارا حصہ خرید لے گا جس سے اس کا حصہ ”صفر“ رہ جائے گا۔ اور عمیل کا حصہ سو فیصد ہو جائیگا۔

یہ طریقہ کار تمویل کار کو یہ اجازت دیتا ہے کہ جائیداد میں اپنی ملکیت کے تناسب سے کرایہ کا دعویٰ کرے اور اسی کے ساتھ اپنے حصے کے یونٹس کی بیع کے ذریعے سے اپنا اصل سرمایہ وقفے وقفے سے واپس حاصل کرے۔“ [ایضاً۔ ص: ۸۵، ۸۶، ۸۷]

یہ اقتباس ہے تو طویل مگر اس سے مشارکہ متناقضہ کی عملی صورت پوری طرح نکھر کر سامنے آ جاتی ہے۔ اس اقتباس میں کوئی ایسی بات نہیں جو قابل تشریح ہو۔ اس حوالے سے یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ بینک اپنے حصے کا کرایہ مارکیٹ ریٹ کی بجائے شرح سود کے مطابق وصول کرتا ہے۔

مشارکہ متناقضہ شراکت کی کس قسم میں داخل ہے:

”المعايير الشرعية“ کے مطابق شرکت کی یہ جدید قسم ”شِرْكَةُ الْعِنَان“ کی ذیلی شاخ ہے۔ لہذا اس پر وہ تمام احکام نافذ ہوں گے جو عام شرکت پر ہوتے ہیں۔ خصوصاً شرکت العنان کے۔ علامہ وہبہ زحیلی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس کو شرکت العنان ہی قرار دیا ہے۔ [المعاملات المالية المعاصرة: ص ۴۳۶]

”شِرْكَةُ الْعِنَان“ کیا ہے؟

شراکت کی بنیادی قسمیں دو ہیں:

۱۔ شِرْكَةُ الْأَمْلَاكِ۔

۲۔ شِرْكَةُ الْعُقُودِ۔

شرکہ املاک کسی چیز کے استحقاق میں شراکت کا نام ہے جیسے کسی اثاثے، کارخانے یا گاڑی وغیرہ کی ملکیت میں اشتراک۔ جبکہ تصرف میں اشتراک کو شرکت العقود کہا جاتا ہے۔ جیسے خرید و فروخت میں اشتراک، یہ اشتراک یا تو مال و عمل دونوں میں ہوگا یا صرف عمل میں۔ اسکی پانچ قسمیں ہیں۔

”اگر مال و عمل دونوں میں شراکت ہو تو اس کو شرکت العنان کہا جاتا ہے۔“

[الملخص الفقہی: ص ۲، ص ۶۸]

چونکہ ہمارے زیر بحث یہی قسم ہے اس لیے ہم صرف اسی کے متعلق گفتگو کریں گے۔ علامہ ابن قدامہ رحمۃ اللہ علیہ نے اسکی حقیقت ان الفاظ میں بیان کی ہے:

((ان يشترك رجلان بماليهما على ان يعمل فيهما بابدانهما

والربح بينهما)) [المغنی: ص ۷، ص ۱۲۳]

”دو شخص اپنے اپنے مال کے ساتھ اس شرط پر اشتراک کریں کہ دونوں جسمانی محنت کریں گے اور نفع ان دونوں میں تقسیم ہوگا۔

شیخ صالح بن فوزان رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

((فحقیقة شركة العنان ان يشترك شخصان فاكثر بماليهما بحيث يصيران مالا واحدا يعملان فيه بيديهما او يعمل فيه احدهما ويكون له الربح اكثر من نصيب الآخر))

[الملخص الفقهي: ۲ ص ۷۱]

”شركة العنان“ کی حقیقت یہ ہے کہ دو یا دو سے زیادہ افراد اپنے مالوں کے ساتھ شراکت داری کریں اس طرح کہ دونوں کا مال ایک ہی بن جائے۔ دونوں اس میں جسمانی محنت کریں یا ان میں سے صرف ایک کرے (دوسری صورت میں) کام کرنے والے کے نفع کا حصہ دوسرے سے زیادہ ہوگا۔

”المعايير الشرعية“ میں ہے:

”شركة عنان اس چیز کا نام ہے کہ دو یا دو سے زیادہ متعین مال کے ساتھ شراکت داری کریں اس طرح دونوں میں سے ہر ایک کو شراکت کے مال میں تصرف کا حق ہو اور نفع ان دونوں کے درمیان طے شدہ اصول کے مطابق تقسیم ہوگا اور خسارہ اپنے اپنے حصے کے مطابق برداشت کریں گے۔“ [ص ۱۹۵]

ان عبارتوں سے یہ بات واضح طور پر ثابت ہوتی ہے کہ شركة العنان میں فریقین کا مقصد چیز کو فروخت کر کے نفع کمانا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شركة العنان کی شرطوں میں ایک شرط یہ ہے کہ نفع میں فریقین میں سے ہر ایک کا حصہ طے ہو۔ ملاحظہ ہو:

[نیل المآرب بشرح دلیل الطالب: ص ۱۹۳، الملخص الفقهي: ۲ ص ۷۰-]

لیکن جب ہم بینکوں میں رائج مشارکہ متناقضہ کو دیکھتے ہیں تو اس میں یہ چیز نظر نہیں آتی یہاں نہ تو نفع کا تناسب طے ہوتا ہے اور نہ ہی کلائنٹ کا مقصد اس کو فروخت کر کے نفع کمانا بلکہ وہ تو اپنی رہائش کے لیے یہ معاملہ کرتا ہے۔ لہذا ثابت ہوا کہ مشارکہ متناقضہ شرکہ عنان میں داخل نہیں ہے۔

مشارکہ متناقضہ میں بینک اپنے حصے کے یونٹ کس قیمت پر بیچے گا:

یہاں چار صورتیں ہی ممکن ہیں:



۱۔ بینک نے جتنی رقم لگائی ہے اس سے زیادہ کے بدلے بیچے۔

۲۔ اتنے ہی کا بیچے۔

۳۔ اس سے کم پر بیچے۔

۴۔ بازاری قیمت کے مطابق فروخت کرے۔

تیسری صورت ممکن نہیں کیونکہ اس میں بینک راضی نہیں ہوگا۔ باقی تین صورتیں شرعاً جائز نہیں۔ پہلی صورت اس لیے کہ اس میں گویا بینک نے ضمانت لی ہے کہ اس کا رأس المال مع نفع اسے لوٹایا جائیگا۔ یہ شراکت کے اصولوں کے خلاف ہے۔ شرکت کی تو بنیاد ہی اس پر ہے کہ نفع اور نقصان میں دونوں شریک ہوں گے گویا یہ حصول سود کا ایک حیلہ ہے۔

دوسری صورت (یعنی اتنے ہی کا بیچے) کو خود اسلامی بینکنگ کے ماہرین ناجائز قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ المعاییر الشرعية میں ہے:

((ولا يجوز اشتراط البيع بالقيمة الاسمية)) [ص ۲۰۷]

”قیمت اسمیہ (Face Value) پر بیع کی شرط لگانا جائز نہیں۔“

دوسری جگہ ہے:

((ولا يجوز الوعد بالشراء بالقيمة الاسمية)) [ص ۱۹۹]

”قیمت اسمیہ (Face Value) پر خریدنے کا وعدہ کرنا ناجائز ہے۔“

اس کی وجہ بھی یہ ہے کہ گویا بینک نے یہ گارنٹی حاصل کر لی ہے اس کا رأس المال بہر صورت واپس کیا جائے گا۔ یہ شراکت کے اصول کے منافی ہے۔

آخری صورت اس لیے جائز نہیں کہ اس میں غرر پایا جاتا ہے کیونکہ کلائنٹ کی طرف سے خریدنے کا وعدہ لازمی ہوتا ہے جس سے وہ منحرف نہیں ہو سکتا۔ اس کے متعلق ہم اوپر بتا چکے ہیں کہ بیع میں لازمی وعدہ بیع ہی کی ایک شکل ہے۔ جب بیع اس شرط پر ہو کہ مستقبل میں جو بازاری قیمت ہوگی اس پر میں خرید لوں گا تو اس میں غرر واضح ہے۔

بینک اپنا حصہ کس قیمت پر فروخت کرتا ہے:

اس تحقیق کی غرض سے جب ہم نے اسلامی بینکاری کے ریسرچ سکا لرنر جناب محمد ایوب جو اسٹیٹ بینک شعبہ اسلامی بینکاری کے اسٹنٹ رہے ہیں اور انہوں نے اس موضوع پر انگریزی میں ایک کتاب بھی لکھی ہے جو لندن سے شائع ہو چکی ہے، سے پوچھا تو ان کے بقول بینک اپنے یونٹس قیمت اسمیہ پر فروخت کرتا ہے۔ کیونکہ بینک کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ اپنے لگائے ہوئے سرمایہ کو مختلف یونٹس میں تقسیم کر لیتا ہے۔ مثلاً اگر بینک نے دس لاکھ روپیہ لگایا ہے تو وہ اس کو پچاس پچاس ہزار کے بیس یونٹس میں تقسیم کرے گا۔ جو کلائنٹ نے وقفے وقفے سے اتنی ہی قیمت میں خریدنے ہوتے ہیں۔ ہمارے اس سوال پر کہ یہ تو شریعہ سٹینڈرز کے مطابق جائز نہیں، انہوں نے کہا کہ شریعہ سٹینڈرز مشارکہ متناقضہ کو شرکہ العنان جو کہ شرکہ عقد کی قسم ہے کے تناظر میں دیکھتا ہے جبکہ اسلامی بینک اس کو شرکہ ملک میں شمار کرتے ہیں۔ شرکہ عقد میں تو قیمت اسمیہ پر فروخت کرنے کا معاہدہ نہیں ہو سکتا البتہ شرکہ ملک میں جائز ہے۔ لیکن یہ رائے دو وجہ سے درست نہیں۔

۱۔ بقول ڈاکٹر رفیق یونس مشارکہ متناقضہ میں بینک کی غرض شراکت داری نہیں ہوتی نہ ہی اس کے پیش نظر بیع اور اجارہ ہوتا ہے بلکہ اصل مقصد فنانسنگ ہے۔ اس میں بیع اور اجارہ کو گھسیٹنے کا مقصد تو صرف فنانسنگ کے ذریعے فائدہ حاصل کرنا ہے۔ جیسا کہ ہم پیچھے ان کے حوالے سے بیان کر آئے ہیں۔

۲۔ شرکہ ملک میں کوئی فریق دوسرے کو اس پر مجبور نہیں کر سکتا کہ وہ ضرور اس کا حصہ خریدے جبکہ یہاں شروع ہی میں یہ معاہدہ ہو جاتا ہے کہ کلائنٹ بینک کا حصہ خریدنے کا پابند ہوگا۔ ڈاکٹر رفیق یونس مصری بینکوں میں رائج مشارکہ متناقضہ پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

((ولا شك ان المشروعية تكون حيث يكون الوعد غير ملزم والتناقض بالقيمة السوقية، والتنازل عن الملكية تدريجيا مع كل قسط..... وقل من يفعل ذلك كله من المصارف الاسلامية، سبب ذلك ان هذه العملية ظاهرها المشاركة وحققتها التمويل المصرفي)) [المصارف الاسلامية: ص ٤٢]

”اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ تب جائز ہو سکتا ہے جب وعدہ لازمی نہ ہو اور بازاری قیمت پر فروخت ہو اور بینک اپنی ملکیت سے ہر قسط سے تدریجاً دست کش ہو۔ شاذ و نادر ہی کوئی اسلامی بینک ایسا ہوگا جو یہ تمام شرطیں پوری کرتا ہو۔ اس کا سبب یہ ہے بظاہر یہ کاروائی مشارکہ اور حقیقت میں بینکنگ فنانسنگ ہے۔“

### تَوْرُقُ:

مروجہ اسلامی بینکوں میں فنانسنگ کا چوتھا ذریعہ تورق ہے۔ اس کا مطلب ایسی بیع ہے جس کا مقصد چیز کو ذاتی استعمال میں لانا یا نفع کمانا نہیں بلکہ محض نقدی حاصل کرنا ہوتا ہے۔ مثلاً ایک شخص کو نقدی کی ضرورت ہے تو وہ کوئی چیز ادھار زیادہ قیمت پر خرید کر نقد کم پر فروخت کر دے۔ اس میں یہ ضروری ہوتا ہے کہ وہ چیز کسی تیسرے شخص کو فروخت کرے نہ کہ اسی کو جس سے خریدی ہے۔ چنانچہ الموسوعة الفقيه الكويتية میں بیع تورق کا اصطلاحی معنی یوں لکھا ہے:

((والتورق في الاصطلاح ان يشتري سلعة نسيئة ثم يبيعها نقدا بغير البائع باقل مما اشتراها به ليحصل بذلك على النقد))

”اصطلاح میں تورق کا معنی ہے کہ آدمی کوئی چیز ادھار خریدے پھر بیچنے والے کے علاوہ کسی دوسرے کے پاس قیمت خرید سے کم قیمت پر فروخت کر دے تاکہ اس طریقہ سے نقد رقم حاصل کر سکے۔“

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

((ولو كان مقصود المشتري الدرهم وابتاع السلعة الى اجل

ليبيعتها وياخذ ثمنها فهذا يسمي التورق)) [مجموعه فتاوى:

۲۹، ص ۳۰]

”اگر خریدار کا مقصد درہم ہو اور وہ ادھار سودا خریدے تاکہ اسے بیچ کر پیسے حاصل کر سکے تو اسے تورق کہتے ہیں۔“

دوسری جگہ بیع عینہ اور تورق میں فرق بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

((واما الذي لم يعد الى البائع بحال بل باعها المشتري من مكان اخر لجاره فهذا يسمي التورق))

[مجموعه فتاوى: ۲۹ ص ۴۳]

”جب چیز کسی بھی حالت میں بائع کی طرف نہ لوٹے بلکہ مشتری اس کو دوسری جگہ فروخت کر دے تو اسکو تورق کہا جاتا ہے۔“

تورق اور بیع عینہ میں فرق:

امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((فهذا المضطر ان اعاد السلعة الى بائعها فهي العينة وان

باعها لغيره فهو التورق)) [اعلام الموقعين: ج ۳ ص ۹۴۹]

”مجبور شخص اگر چیز کو بیچنے والے کے پاس فروخت کرے تو اسکو عینہ کہتے ہیں اگر وہی چیز کسی دوسرے کے پاس فروخت کرے تو اس کو تورق کہتے ہیں۔“

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

((فَأَحْمَدُ رَحِمَهُ اللَّهُ تَعَالَى أَشَارَ إِلَى أَنَّ الْعَيْنَةَ إِنَّمَا تَقَعُ مِنْ

رَجُلٍ مُضْطَرٍّ إِلَى نَقْدٍ لِأَنَّ الْمُؤَسَّرَ يَضُنُّ عَلَيْهِ بِالْقَرْضِ فَيَضْطَرُّ

إِلَى أَنْ يَشْتَرِيَ مِنْهُ سِلْعَةً ثُمَّ يَبِيعُهَا فَإِنْ اشْتَرَاهَا مِنْهُ بِأَيْعِهَا

كَانَتْ عَيْنَةً وَإِنْ بَاعَهَا مِنْ غَيْرِهِ فَهِيَ التَّورُقُ))

[تهذيب السنن: ج ۵، ص ۱۰۸]

”امام احمد رضی اللہ عنہ نے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ بیع عینہ کا معاملہ اس شخص سے ..... ہوتا ہے جو نقدی کا محتاج ہوتا ہے کیونکہ خوشحال شخص اسکو قرض دینے میں بخل سے کام لیتا ہے تو وہ اس پر مجبور ہو جاتا ہے کہ اس سے کوئی چیز خرید کر پھر اس کو بیچ دے۔ اگر اس چیز کو وہ بیچنے والا ہی خریدے تو یہ بیع عینہ ہوتی ہے اور اگر وہ کسی دوسرے کے پاس بیچے تو اس کو تورق کہتے ہیں۔“

قطر کے معروف عالم ڈاکٹر علی احمد سالوس رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

((والتورق بهذا المعنى هو العينة عند الائمة الاربعة و من جاء بعدهم ببضعة قرون ولعل شيخ الاسلام ابن تيمية هو اول من ذكر هذا التورق ثم جاء اقوال الحنابلة من بعده))

[موسوعة القضايا الفقيهية المعاصرة: ص ۸۹۸]

”آئمہ اربعہ اور ان کے بعد کئی صدیوں تک جو آئے ان کے نزدیک اس معنی میں تورق بیع عینہ ہی ہے۔ شاید شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے اس تورق کا ذکر کیا پھر ان کے بعد فقہاء حنابلہ کے اقوال میں اس کا تذکرہ آیا ہے۔“

”الموسوعة الفقيهية“ کے مطابق اس اصطلاح کا ذکر صرف فقہاء حنابلہ کے ہاں ملتا ہے دوسرے فقہاء اسکو بیع عینہ کے تحت زیر بحث لاتے ہیں۔

((يذكر الفقهاء التورق في بحث بيع العينة والبيوع المنهية عنها والربا))

”فقہاء بیع تورق کو بیع عینہ ممنوعہ بیوع اور سود کی بحث میں ذکر کرتے ہیں۔“

تورق کا شرعی حکم:

اس کے شرعی حکم میں تین آراء ہیں:

۱۔ سعودی عرب کے سابق مفتی اعظم شیخ عبدالعزیز بن باز رحمۃ اللہ علیہ کی رائے میں یہ جائز

- ہے۔ [فتاویٰ اسلامیہ: ج ۲۔ ص ۲۲۳] بعض دوسرے علماء کی بھی یہی رائے ہے۔
- ۲۔ شیخ عثیمین رحمۃ اللہ علیہ کی رائے میں اگر انسان کو رقم کی ضرورت ہو اور یہ جائز طریقہ سے ممکن نہ ہو اور عقد میں سود کی مشابہت نہ پائی جائے اور آدمی چیز کو قبضے کے بعد ہی فروخت کرے تو اس کی اجازت ہے ورنہ نہیں۔ [رسائل فقیہہ: ص ۱۰۷]
- ۳۔ یہ کسی بھی صورت جائز نہیں۔

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز اور ایک روایت کے مطابق امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے اسکو مکروہ کہا ہے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز فرماتے ہیں:

((التورق اخیة الربا ای اصل الربا وهذا القول اقوی))

[مجموعہ فتاویٰ: ۲۹ ص ۴۳۱]

”تورق ربا کی جڑ ہے یعنی ربا میں ملوث کرنے کا باعث ہے یہ قول زیادہ قوی ہے۔“  
عظیم محدث امام ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

((وکان شیخنا رحمہ اللہ یمنع من مسالة التورق وروجع فیہا مرارا وانا حاضر فلم یرخص فیہا وقال المعنی الذی لاجلہ حرم الربا موجود فیہا بعینہ من زیادة الکلفة بشراء السلعة وبيعها والخسارة فیہا فالشریعة لاتحرم الضرر الادنی وتبیح ما هو اعلی منه)) [اعلام الموقعین: ج ۳ ص ۹۵۰]

”ہمارے استاد (امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ) تورق سے منع کرتے تھے۔ ان سے میری موجودگی میں متعدد مرتبہ پوچھا گیا مگر انہوں نے اس کی اجازت نہ دی وہ فرماتے تھے جس وجہ سے سود کو حرام قرار دیا گیا ہے وہ اس (تورق) میں بعینہ موجود ہے۔ اس کے ساتھ چیز خریدنے اور بیچنے کی تکلیف الگ ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ شریعت کم تر ضرر کو تو حرام قرار دے مگر بڑے ضرر کو جائز قرار دے۔“

الموسوعة الفقية الكويتية میں لکھا ہے کہ جمہور علماء اس کو جائز سمجھتے ہیں۔ لیکن ڈاکٹر علی احمد سالوس رحمۃ اللہ علیہ موسوعہ کے اس دعویٰ سے متفق نہیں ہیں۔ چنانچہ انہوں نے دلائل سے ثابت کیا ہے کہ جمہور فقہاء بھی اس کو غلط ہی قرار دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں یہ بیع عینہ ہی میں شامل ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے انکی کتاب ”موسوعة القضايا الفقيهية المعاصرة“

راجہ رائے:

اگر قائلین اور مانعین کے دلائل کا موازنہ کیا جائے تو ان حضرات کی رائے زیادہ قوی معلوم ہوتی ہے جو اس کے حق میں نہیں ہیں۔ نتیجے کے اعتبار سے تورق اور سود میں کوئی فرق نہیں ہے۔ کیونکہ جب تورق میں اصل غرض نقدی حاصل کرنا ہے نہ کہ کسی بھی لحاظ سے چیز سے فائدہ اٹھانا تو ادھار کی صورت میں زیادہ قیمت لینے کا کوئی جواز باقی نہیں رہتا۔ اسی لیے تو امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ جس وجہ سے سود حرام ہے وہ اس میں بعینہ موجود ہے۔ بلکہ خرید و فروخت کی تکلیف اضافی ہے۔

بینکوں میں تورق کا استعمال:

ہماری معلومات کے مطابق پاکستان میں ابھی تک اسلامی بینکوں نے اس پر عمل شروع نہیں کیا۔ البتہ ملائیشیا اور بعض عرب ممالک میں کچھ سالوں سے اس کا استعمال جاری ہے۔ زیادہ تر یہ معاملہ عالمی مارکیٹ میں میٹل جیسے زنک، برونز، نکل اور تانبے وغیرہ کے سودوں میں کیا جاتا ہے۔ اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ ایک ایسا گاہک جس کو نقدی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسلامی بینک سے یہ کہتا ہے کہ وہ اس نوع کا میٹل جو عام طور پر دوسرے ملک میں ہوتا ہے، ادھار قسطوں پر خریدنے کے لیے تیار ہے۔ یہ سودا میٹل کے یونٹ کے حساب سے ہوتا ہے۔ جس کا وزن اور قیمت طے ہوتی ہے اور یہ بھی پہلے ہی طے ہوتا ہے کہ سود اکممل ہونے کے بعد بینک گاہک کے وکیل کی حیثیت سے اس

کو آگے فروخت کر کے رقم اس کے کھاتے میں جمع کر دے گا۔ جو وہ نکلوا کر اپنی ضرورت پوری کر سکے گا۔ ظاہر ہے کہ بینک نے ادھار کی صورت میں زیادہ قیمت لگانی ہے اور آگے کم قیمت پر فروخت کرنا ہے۔ دونوں سودوں کے درمیان جو فرق ہو گا وہ بینک کا نفع ہو گا۔ مثلاً بینک نے ایک لاکھ ڈالر کا ایک سود ادھار قسطوں پر بیچا ہے تو وہ اس کے وکیل کی حیثیت سے آگے اس کو پچانوے ہزار ڈالر میں فروخت کر کے رقم اس کے کھاتے میں جمع کروادے گا۔ جس سے وہ اپنی مالی ضرورت پوری کر لے گا۔ بینک ایک لاکھ ڈالر قسطوں میں وصول کرے گا۔ اس طرح بینک کو پانچ ہزار ڈالر کا فائدہ ہو جائے گا۔ تورق کی یہ قسم کئی لحاظ سے سطور بالا میں بیان ہونے والی قسم سے مختلف ہے۔

✽ اس میں فروخت کنندہ یعنی بینک خریدار اور فروخت کنندہ کے درمیان واسطہ ہوتا ہے۔ جبکہ پہلی قسم میں فروخت کنندہ کا درمیان میں کوئی کردار نہیں ہوتا۔

✽ تورق کی اس نوع میں نقدی کا ضرور تمند خود بینک سے جس کا اب وہ مدیون (مقروض) ہو چکا ہے رقم وصول پاتا ہے۔ جبکہ تورق کی اول الذکر قسم میں وہ آخری خریدار سے خود وصول پاتا ہے۔ اس میں پہلے فروخت کنندہ کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔

✽ اسلامی بینکوں میں رائج تورق ادھار اور نقد دو بیعوں کو مجموعہ ہوتی ہے۔ جو حقیقت میں ایک دوسرے کے ساتھ مشروط ہوتی ہے۔ فقہی تورق میں یہ چیز نہیں ہوتی۔

✽ فقہی تورق میں وہ چیز زیادہ یا قیمت خرید پر بکنے کا احتمال بھی ہوتا ہے لیکن بینکوں میں رائج تورق میں اس کا کم قیمت پر بیچنا طے ہوتا ہے۔

شرعی حیثیت:

✽ جب رائج رائے مطابق تورق بذات خود منع ہے تو یہ صورت بدرجہ اتم ممنوع ہونی چاہیے کیونکہ یہ کئی لحاظ سے اس سے مختلف ہے اور پھر سب کام بینک کے کرنے کی وجہ سے اس کی مشابہت سود اور بیع عینہ سے ہو جاتی ہے۔



❁ نبی ﷺ کا فرمان ہے ایک بیع میں دو شرطیں درست نہیں۔ اس میں تو کئی شرطیں پائی جاتی ہیں مثلاً:

\* یہ شرط کہ مشتری بینک کو وکیل بنائے گا۔

\* مشتری وکالت منسوخ نہیں کر سکتا۔

\* بینک کی قیمت خرید سے زیادہ پیسے دے گا۔

\* آگے کم قیمت پر فروخت کرے گا۔

❁ جس چیز پر سودا ہوتا ہے وہ بینک کے پاس پہلے سے موجود نہیں ہوتی بلکہ بینک بعد میں خریدتا ہے۔ اس طرح یہ ”مرابحة للامر بالشراء“ ہے جو بذات خود جائز نہیں۔

### بَيْعٌ سَلَمٌ:

بعض اسلامی بینکوں میں تمویلی سرگرمیوں کے لئے بیع سلم کا استعمال بھی جاری ہے سلم ایک معروف شرعی اصطلاح ہے جس سے مراد لین دین اور خرید و فروخت کی وہ قسم ہے جس میں ایک شخص یہ ذمہ داری قبول کرتا ہے کہ وہ مستقبل کی فلاں تاریخ پر خریدار کو ان صفات کی حامل فلاں چیز مہیا کرے گا۔ شیخ الاسلام حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

((وَالسَّلْمُ شَرْعًا بَيْعٌ مَوْصُوفٌ فِي الذَّمَّةِ))

[فتح الباری: ج ۴، ص ۵۴۰]

”سلم کا شرعی معنی ہے ایسی چیز بیچنے کی ذمہ داری اٹھانا جس کی صفات بیان کر دی گئی ہوں۔“

اس کو سلف بھی کہتے ہیں کیونکہ اس میں بیچی گئی چیز کی قیمت معاہدے کے وقت ہی ادا کر دی جاتی ہے۔ یعنی یہ بیع کی وہ قسم ہے جس میں قیمت تو فوری ادا کر دی جاتی ہے مگر چیز بعد میں فراہم کی جاتی ہے۔

نبی ﷺ جب ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لائے تو یہاں بیع کی یہ صورت بھی رائج تھی آپ ﷺ نے اس سے کلیتہً منع کرنے کی بجائے بنیادی اصلاحات کر کے اس کو باقی رکھا جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں:

((قَدِمَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْمَدِينَةَ، وَهُمْ يُسَلِفُونَ بِالْتَّمْرِ السَّنَتَيْنِ وَالثَّلَاثَ، فَقَالَ مَنْ أَسْلَفَ فِي شَيْءٍ فَفِي كَيْلٍ مَعْلُومٍ وَوَزْنٍ مَعْلُومٍ، إِلَى أَجَلٍ مَعْلُومٍ)) [صحيح بخاری: باب السلم في وزن معلوم]

”نبی ﷺ مدینہ تشریف لائے تو لوگ کھجوروں میں دو اور تین سال کے لیے بیع سلم کرتے تھے اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: جو شخص بیع سلم کرنا چاہتا ہے وہ متعین پیمانے اور وزن میں متعین مدت کے لیے کرے۔“

دوسری جگہ فرماتے ہیں:

((أَشْهَدُ أَنَّ السَّلْفَ الْمَضْمُونِ إِلَى أَجَلٍ مُسَمًّى قَدْ أَحَلَّهُ اللَّهُ فِي كِتَابِهِ وَأَذِنَ فِيهِ ثُمَّ قَرَأَ ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدِينٍ إِلَى أَجَلٍ مُسَمًّى فَاكْتُبُوهُ﴾)) [مصنف ابن ابی شیبہ: ج ۵، ص ۲۷۷، مستدرک حاکم: ج ۷ ص ۲۵۸]

”میں گواہی دیتا ہوں کہ مقررہ مدت تک ضمانت دی گئی سلم کو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں جائز قرار دیا ہے اور اس کی اجازت دی ہے۔ پھر انہوں نے قرآن حکیم کی یہ آیت تلاوت فرمائی۔“

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدِينٍ إِلَى أَجَلٍ مُسَمًّى فَاكْتُبُوهُ﴾ [البقرة: ۲۸۲]

”اے ایمان والو! جب تم آپس میں مقررہ وقت تک ادھار کا معاملہ کرو تو اس کو لکھ لیا کرو۔“

حضرت عبداللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

((إِنَّا كُنَّا نُسَلِّفُ عَلَى عَهْدِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ  
وَأَبِي بَكْرٍ وَعُمَرَ فِي الْحِنْطَةِ، وَالشَّعِيرِ وَالزَّيْبِ، وَالتَّمْرِ))

[صحیح بخاری: باب السلم فی وزن معلوم]

”ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، ابو بکر اور عمر رضی اللہ عنہما کے دور میں گندم، جو، کھجور اور منقہ میں بیع  
سلم کرتے تھے۔“

شیخ الاسلام حافظ ابن حجر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

((وَاتَّفَقَ الْعُلَمَاءُ عَلَى مَشْرُوعِيَّتِهِ إِلَّا مَا حُكِيَ عَنْ ابْنِ الْمُسَيَّبِ))

[فتح الباری: ج ۴ ص ۵۴۰]

”سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ کے علاوہ تمام علماء اس کے جواز پر متفق ہیں۔“

سلم کی اجازت کا فلسفہ:

بعض کسانوں اور مینوفیکچررز کے پاس ضرورت کے مطابق مثلاً بیج، کھادوں،  
آلات، خام مال خریدنے اور لیبر کے لیے رقم نہیں ہوتی۔ ایسے لوگوں کو اسلام نے یہ  
سہولت دی ہے کہ وہ حصول رقم کی خاطر اپنی فصل یا پیداوار قبل از وقت فروخت کر سکتے  
ہیں تاکہ قرض کے لیے کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے سے بچے رہیں۔ اضافی فائدہ یہ ہوتا  
ہے کہ آدمی چیز بیچنے کے لیے کسٹمر تلاش کرنے کی فکر سے آزاد ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اس کا  
سودا پہلے ہی ہو چکا ہوتا ہے۔ اس سے خریدار کو بھی فائدہ پہنچتا ہے کیونکہ سلم میں قیمت ان  
چیزوں کی نقد قیمت سے کم ہوتی ہے جو نقد ادا کی جانی ہو۔ مزید برآں اگر چیز آگے بیچنا  
چاہتا ہو تو مارکیٹنگ کے لیے مناسب وقت مل جاتا ہے۔

کیا سلم خلاف قیاس ہے؟

شرعی اصول کے مطابق انسان کو وہی چیز بیچنے کی اجازت ہے جو نہ صرف وجود میں  
آچکی ہو بلکہ اس کی ملکیت اور قبضہ میں ہو جبکہ سلم میں عقد کے وقت چیز کا وجود ہی نہیں

ہوتا۔ اس بنا پر بعض فقہاء نے کہا ہے کہ سلم بیع معدوم کی ایک استثنائی صورت ہے۔ مگر امام ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ اس سے متفق نہیں ہیں چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

((وَأَمَّا السَّلْمُ فَمَنْ ظَنَّ أَنَّهُ عَلَىٰ خِلَافِ الْقِيَاسِ تَوَهُّمٌ دَخُولُهُ تَحْتَ قَوْلِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَبِعَ مَا لَيْسَ عِنْدَكَ فَإِنَّهُ يَبِيعُ مَعْدُومًا وَالْقِيَاسُ يَمْنَعُ مِنْهُ وَالصَّوَابُ أَنَّهُ عَلَىٰ وَفْقِ الْقِيَاسِ فَإِنَّهُ يَبِيعُ مَضْمُونًا فِي الذِّمَّةِ مَوْصُوفًا مَقْدُورًا عَلَىٰ تَسْلِيمِهِ غَالِبًا وَهُوَ كَالْمَعَارِضَةِ عَلَىٰ الْمَنَافِعِ فِي الْإِجَارَةِ وَقَدْ تَقَدَّمَ أَنَّهُ عَلَىٰ وَفْقِ الْقِيَاسِ)) [اعلام الموقعين: ج ۲، ص ۱۹]

”اس کا مطلب ہے کہ جو حضرات سلم کو خلاف قیاس سمجھتے ہیں وہ اس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد ”جو چیز تیرے پاس موجود نہیں اس کو فروخت نہ کر۔“ میں داخل سمجھنے کی غلطی کرتے ہیں جبکہ صحیح بات یہ ہے کہ یہ قیاس کے مطابق ہے۔ کیونکہ یہ ایسی بیع ہے جس میں انسان ایسی چیز جس کو عام طور پر حوالے کر سکتا ہوتا ہے بیان کی گئی صفات کے مطابق بیچنے کی ذمہ داری اٹھاتا ہے۔ یہ اجارہ میں منفعت کا معاوضہ لینے جیسی صورت ہے۔ اور یہ پہلے گزر چکا ہے کہ یہ قیاس کے مطابق ہے۔“

سلم کی شرطیں:

اس میں ان تمام پابندیوں کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے جو شریعت نے عام بیع کیلئے مقرر کی ہیں تاہم معاملہ کو غرر سے پاک رکھنے کے لیے کچھ خاص شرطیں بھی رکھی گئی ہیں۔ مثلاً:

✽ جس چیز کا سودا کیا جا رہا ہو معاہدے کے وقت اس کی نوعیت، اوصاف، مقدار، تعداد اور مالیت کا تعین پہلے سے کیا جاسکتا ہو۔ جن چیزوں میں یہ ممکن نہ ہو ان میں بیع سلم جائز نہیں ہوتی۔ جیسے قیمتی موتی، جواہرات اور نوادرات ہیں کیونکہ ان کی اکائیاں ایک دوسرے سے کافی مختلف ہوتی ہیں۔

جو چیز بیچی اور جو قیمت میں دی جا رہی ہو دونوں کا تعلق ان اموال سے نہ ہو جن میں فوری قبضہ کی شرط ضروری ہے جیسے چاندی کے عوض سونے کی بیع یا گندم کے بدلے گندم کا سودا۔ کیونکہ اس قسم کے تبادلہ میں موقع پر قبضہ شرط ہے۔

مکمل قیمت معاہدہ کے وقت ہی ادا کر دی جائے۔ نبی ﷺ کا ارشاد ہے۔

((مَنْ سَلَفَ فِي تَمْرٍ فَلْيُسَلِفْ فِي كَيْلٍ مَعْلُومٍ ، وَوَزْنٍ مَعْلُومٍ))

[صحیح بخاری: کتاب السلم، باب السلم فی کیل معلوم]

”جو کھجوروں میں بیع سلف کرے وہ معلوم پیمانے اور معلوم وزن میں کرے۔“

سلف سلم کا دوسرا نام ہے اور اس کو سلف اس لے کہا جاتا کہ اس میں قیمت پیشگی ادا کر دی جاتی ہے جیسا کہ ہم پہلے بیان کر آئے ہیں یعنی پیشگی قیمت کی شرط آپ ﷺ نے خود لگائی ہے۔ اور اگر پوری قیمت پہلے ادا نہ کی جائے تو یہ ادھار کا ادھار کے ساتھ تبادلہ ہوگا جو شرعاً ممنوع ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((وَأْتَفَقُوا عَلَى أَنَّهُ يَشْتَرِطُ لَهُ مَا يَشْتَرِطُ لِلْبَيْعِ ، وَعَلَى تَسْلِيمِ

رَأْسِ الْمَالِ فِي الْمَجْلِسِ)) [فتح الباری: ۴ ص ۵۴۰]

”علماء اس پر متفق ہیں کہ اس کی بھی وہی شرطیں ہیں جو عام بیع کی ہیں اور اس پر بھی متفق ہیں کہ مجلس میں اس المال حوالے کرنا ضروری ہے۔“

امام شوکانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

((هذا الشرط لا بد منه ولا يتم السلم إلا به وإلا كان من بيع

الكالء بالكالء وقد قدمنا النهى عنه)) [السیل الجرار: کتاب

البيع باب السلم]

”یہ شرط ضروری ہے اس کے بغیر سلم مکمل نہیں ہوتی ورنہ یہ ادھار کی ادھار کے ساتھ

بیع ہوگی۔ اور اس کی ممانعت ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔“

مدت حوالگی پوری طرح واضح ہوئے اگر اس میں کسی قسم کا ابہام پایا جائے تو بیع سلم

درست نہ ہوگی۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نقل کرتے ہیں:

((أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهَى عَنْ بَيْعِ حَبْلِ الْحَبْلَةِ، وَكَانَ يَبْعًا يَتْبَاعُهُ أَهْلُ الْجَاهِلِيَّةِ، كَانَ الرَّجُلُ يَتَّاعُ الْجَزُورَ إِلَى أَنْ تُنْتَجَ النَّاقَةُ، ثُمَّ تُنْتَجُ الَّتَى فِي بَطْنِهَا))

[صحیح بخاری: باب بیع الغرر و حبل الحبله]

”بلاشبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حاملہ کے حمل کی بیع سے منع فرمایا ہے۔ (نافع کہتے ہیں) بیع کی یہ صورت زمانہ جاہلیت میں رائج تھی۔ آدمی اس وعدہ پر اونٹ خریدتا کہ جب اونٹنی جنے پھر وہ بڑی ہو کر جتنے تب قیمت دوں گا“

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

((لَا تَبَايَعُوا إِلَى الْحَصَادِ وَالذِّيَّاسِ وَلَا تَبَايَعُوا إِلَّا إِلَى أَجَلٍ

مَعْلُومٍ)) [ارواء الغلیل: ج ۵ ص ۲۱۷]

”فصل کاٹنے یا گاہنے تک بیع نہ کرو بلکہ متعین مدت تک کرو۔“

ان دونوں صورتوں میں چونکہ مدت میں ابہام ہے اس لیے یہ جائز نہیں ہیں۔

✽ مخصوص باغ یا زمین کے مخصوص قطعہ کی پیداوار میں بیع سلم نہیں ہو سکتی کیونکہ اس میں غرر پایا جاتا ہے۔ ممکن ہے وہ باغ پھل نہ دے یا قطعہ زمین میں فصل ہی نہ

ہو۔ سعید بن سعد نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا:

((هَلْ لَكَ أَنْ تَبِيعَنِي تَمْرًا مَعْلُومًا إِلَى أَجَلٍ مَعْلُومٍ مِنْ حَائِطِ

بَنِي فُلَانٍ قَالَ لَا أَبِيعُكَ مِنْ حَائِطٍ مُسَمًّى، بَلْ أَبِيعُكَ أَوْ سَقًا

مُسَمَّاءَ إِلَى أَجَلٍ مُسَمًّى)) [فتح الباری: ج ۴ ص ۵۴۶]

”کیا آپ مجھے بنی فلاں کے باغ سے متعین مدت کے لیے متعین کھجوریں فروخت

کریں گے۔ آپ نے فرمایا متعین باغ سے نہیں بلکہ متعین وسق متعین مدت کے

لیے فروخت کرتا ہوں۔“

شیخ الاسلام حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ رقم طراز ہیں:

((وَنَقَلَ ابْنُ الْمُنْذِرِ اتِّفَاقَ الْأَكْثَرِ عَلَى مَنَعِ السَّلْمِ فِي بُسْتَانٍ

مُعَيَّنٍ لِأَنَّهُ غَرَّرَ)) [حوالہ مذکورہ]

”ابن منذر نے متعین باغ میں سلم کی ممانعت پر اکثر کا اتفاق نقل کیا ہے۔“

ڈاکٹر علامہ محمد سلیمان اشقر لکھتے ہیں:

”دور حاضر میں اس کی بعض صورتوں میں نظر ثانی ہونی چاہیے کیونکہ بعض بڑی بڑی فیکٹریاں ایسی ہیں جن کی مصنوعات بہت زیادہ پھیلی ہوئی ہیں اور ان کی مصنوعات میں ایسی خوبیاں ہیں جو دوسری فیکٹریوں کی مصنوعات میں نہیں پائی جاتیں۔ جیسے مرسدیز کمپنی کی گاڑیاں یا توشیبا کے ٹیلیویژن ہیں اگر کوئی مرسدیز گاڑی ۲۰۰ ماڈل ۱۹۹۳ء میں سلم کرنا چاہے تو یہ جائز ہونی چاہیے بلکہ میرے نزدیک گاڑیوں میں اس وقت تک سلم درست نہیں جب تک فیکٹری کا نام ذکر نہ کرے۔ صرف یہ کہہ دینا کافی نہیں کہ گاڑی پانچ سیٹر اور فلاں سال کا ماڈل ہو کیونکہ قیمتوں کے فرق کی وجہ سے اس میں جہالت پائی جاتی ہے جو نزاع کا باعث بن سکتی ہے۔ گاڑیوں کے علاوہ دوسری بڑی فیکٹریوں جن کی پیداوار بازاروں میں عام ہے کا بھی یہی حکم ہے۔ البتہ مخصوص زرعی فارم اور محدود پیداوار کے حامل کارخانے کا یہ حکم نہیں کیونکہ اس کی پیداوار بند بھی ہو سکتی ہے۔“

[بحوث فقہیة فی قضایا اقتصادیة معاصرة: ج ۱، ص: ۱۹۴-۱۹۵]

علامہ سلیمان اشقر کے خیال میں بعض مالکی فقہاء جیسے ابن شاس اور ابن الحاجب کے کلام سے بھی اس نقطہ نظر کی تائید ہوتی ہے۔ انہوں نے متعین باغ کے پھل میں سلم ناجائز ہونے کے ساتھ یہ شرط لگائی ہے ”کہ وہ باغ چھوٹا نہ ہو“ اور جانوروں میں یہ قید لگائی ہے ”کہ ان کا تعلق ایسی نسل سے نہ ہو جو کم پائی جاتی ہو“ اس کا مطلب ہے کہ باغ اگر بڑا اور جانور کی نسل زیادہ پائی جاتی ہو تو اس میں سلم غیر متعین ہی کی طرح ہے۔

مزید لکھتے ہیں کہ بعض فقہاء کے اس کلام ”کہ بڑی بستی کے پھل میں سلم جائز ہے لیکن اگر چھوٹی ہو تو پھر جائز نہیں“ سے بھی اس کو تقویت ملتی ہے۔ [حوالہ مذکورہ] ملاحظہ:

شیرز کے سودوں میں چونکہ کمپنی کا نام ذکر کرنا ضروری ہوتا ہے جس سے اس کی حیثیت متعین چیز میں سلم کی ہو جاتی ہے جو ناجائز ہے ممکن ہے جب سپردگی کا وقت آئے مارکیٹ میں اس کمپنی کے شیرز دستیاب نہ ہوں لہذا شیرز میں بیع سلم درست نہیں۔ سلم میں رہن اور ضمانت طلب کرنا:

بیع سلم میں بیچی گئی چیز چونکہ فروخت کنندہ کے ذمہ ادھار ہوتی ہے لہذا خریدار حوالگی یقینی بنانے کے لیے رہن یا گارنٹی کا مطالبہ کر سکتا ہے۔ ہم اوپر حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے حوالے سے بیان کر آئے ہیں کہ قرآن حکیم کی آیت

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدِينٍ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوهُ﴾ [البقرة: ۲۸۲]

”اے ایمان والو: جب تم آپس میں مقرر وقت تک ادھار کا معاملہ کرو تو اس کو لکھ لیا کرو۔“

میں بیع سلم بھی شامل ہے جبکہ اس سے بعد والی آیت میں ادھار میں رہن کی اجازت دی گئی ہے۔ یعنی سلم میں رہن کا جواز قرآن سے ثابت ہے۔ امام بخاری رضی اللہ عنہ نے اس کے حق میں بایں الفاظ بَابُ الرَّهْنِ فِي السَّلْمِ ”سلم میں رہن کا ثبوت“ عنوان باندھا ہے اور یہ روایت ذکر کی ہے۔ اعمش رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

((تَدَاكُرْنَا عِنْدَ إِبْرَاهِيمَ الرَّهْنِ فِي السَّلْمِ فَقَالَ حَدَّثَنِي الْأَسْوَدُ

عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اشْتَرَى مِنْ يَهُودِيٍّ طَعَامًا إِلَىٰ أَجَلٍ مَّعْلُومٍ، وَارْتَهَنَ مِنْهُ دِرْعًا

(مِنْ حَدِيدٍ)) [صحيح بخاری: باب الرهن في السلم]



”ہم نے ابراہیم کے پاس سلم میں رہن کے متعلق گفتگو کی انہوں نے فرمایا مجھے اسود نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بیان کیا کہ نبی ﷺ نے ایک یہودی سے متعین مدت کے لئے غلہ خریدا اور اس کے پاس لوہے کی زرہ گروی رکھی۔“

سلم میں قبضہ کی مدت:

چونکہ حدیث و سنت میں بیع سلم میں قبضہ کی کم از کم مدت کے متعلق کوئی صراحت نہیں ملتی اس لیے اس بارہ میں فقہاء کا اختلاف ہے بعض کے نزدیک ایک گھڑی کی مہلت بھی کافی ہے جبکہ بعض نصف یوم بعض دو بعض تین اور بعض پندرہ یوم کے قائل ہیں۔ [عمدة القاری: ج ۸ ص ۵۸۱]

علامہ ابن قدامہ رحمہ اللہ کی رائے میں کم از کم اتنی مدت ہونی چاہیے جس کا قیمتوں پر مناسب اثر پڑتا ہو وہ ایک مہینہ یا اس کے قریب ہے۔ [المغنی ج ۶ ص ۴۰۴]

صحیح بات یہ ہے کہ فریقین کو باہمی رضا مندی سے کوئی بھی مدت مقرر کرنے کا اختیار ہے۔

✽ ایک تو اس لیے کہ ذخیرہ احادیث میں نبی ﷺ سے کم از کم مدت کے متعلق کوئی روایت منقول نہیں۔

✽ دوسرا اس لیے کہ سلم کی اجازت کا مقصد لوگوں کو سہولت دینا ہے یہ مقصد تب ہی حاصل ہو سکتا ہے جب مدت کی پابندی نہ ہو۔

حوا لگی میں تاخیر پر جرمانہ:

سلم میں بیچی گئی چیز چونکہ فروخت کنندہ کے ذمے دین (ادھار) ہوتی ہے جس میں تاخیر پر جرمانہ صریح سود شمار ہوتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا قول ہے:

((مَنْ أَسْلَفَ سَلْفًا فَلَا يَشْتَرِطُ إِلَّا قَضَاءَهُ))

[مؤطا امام مالک: باب ما لا يجوز من السلف]

”جو قرض دے وہ ادا ہوگی کے علاوہ کوئی شرط عائد نہ کرے۔“

اسلامی بینکوں کی رہنمائی کے لیے مرتب کردہ شریعہ سٹینڈرڈز میں ہے:

(( لَا يَجُوزُ الشَّرْطُ الْجُزَائِيُّ عَنِ التَّأَخِيرِ فِي تَسْلِيمِ الْمُسْلِمِ فِيهِ ))

[ص ۱۶۲]

”جس چیز میں سلم کا سودا ہوا ہو اس کی تاخیر پر شرط جزائی جائز نہیں۔“

صفحہ ۷۱ میں ممانعت کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ جس چیز کا سودا ہوا ہے وہ بیچنے والے کے ذمہ دین ہے جس پر اضافہ کی شرط سود شمار ہوتی ہے۔

اگر فروخت کنندہ تنگ دستی کی وجہ سے بروقت چیز مہیا نہ کر سکے تو اس کو فراخ دستی تک موقع دیا جائے گا۔

اگر مطلوبہ چیز کی پیداوار کم ہونے یا بازار میں دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے بائع کے لیے بروقت سپردگی ممکن نہ ہو تو خریدار کے پاس دو اختیار ہوتے ہیں۔

۱۔ بازار میں آسانی سے دستیاب ہونے کا انتظار کرے۔

۲۔ سودا ختم کر کے اپنی رقم وصول کر لے۔ [المعايير الشرعية ص: ۱۶۲]

اگر عداً تاخیری حربے استعمال کرے تو خریدار کو گارنٹی بیچنے کا بھی حق ہے، ایسی صورت میں خریدار کے پاس دو اختیار ہوں گے۔

✽ گارنٹی سے حاصل شدہ رقم سے اس قسم کی چیز بازار سے خرید لے۔

✽ یا اپنی اصل رقم وصول پالے۔

لیکن اضافی رقم خواہ جرمانے کے نام پر ہی کیوں نہ ہو وصول نہیں کی جاسکتی۔ بعض حضرات کی رائے میں اگر جرمانہ کی رقم قرض خواہ یا ادھار دینے والے کی آمدن کا حصہ نہ بنے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ لیکن یہ رائے صائب نہیں کیونکہ شرعاً قرض یا ادھار پر مشروط اضافہ سود کے زمرہ میں داخل ہے اس میں آمدن کا حصہ بننے یا نہ بننے کی شرط نہیں۔

قبضہ سے پہلے بیچنا:

سلم کے ذریعے خریدی گئی چیز جب تک خریدار کے قبضہ میں نہ آجائے اس کو آگے فروخت کرنا منع ہے۔ کیونکہ یہ دین ہے جس کو بیچنا شرعاً درست نہیں علاوہ ازیں احادیث میں قبضہ سے قبل فروخت کی ممانعت ہے۔ چنانچہ علامہ ابن قدامہ لکھتے ہیں:

((أَمَّا بَيْعُ الْمُسْلِمِ فِيهِ قَبْلَ قَبْضِهِ ، فَلَا نَعْلَمُ فِي تَحْرِيمِهِ خِلَافًا ، وَقَدْ نَهَى النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ بَيْعِ الطَّعَامِ قَبْلَ قَبْضِهِ وَعَنْ رِبْحِ مَا لَمْ يُضْمَنْ وَإِلَّاهُ مَبِيعٌ لَمْ يَدْخُلْ فِي ضَمَانِهِ ، فَلَمْ يَجْزُ بَيْعُهُ ، كَالطَّعَامِ قَبْلَ قَبْضِهِ)) [المغنی: ج ۹ ص ۶۸]

”سلم کے ذریعے خریدی گئی چیز کو قبضہ سے قبل فروخت کرنے کی حرمت میں ہم کسی اختلاف کا علم نہیں رکھتے۔ بلاشبہ نبی ﷺ نے قبضہ سے قبل غلے کی بیع سے منع فرمایا ہے۔ اور اس چیز کے نفع سے بھی منع فرمایا ہے جس کا رسک نہ اٹھایا گیا ہو۔ اور یہ چیز تو ابھی اس کے رسک میں نہیں آئی لہذا اس کی بیع جائز نہیں جس طرح غلے کی قبضہ سے قبل بیع جائز نہیں۔“

نوٹ: اس چیز کی فروخت کا ایسا وعدہ جس کی پابندی دونوں یا کسی ایک فریق کے لیے لازمی ہو وہ بھی اس ممانعت میں شامل ہیں۔

تجارت میں سلم کا استعمال:

کیا سلم کی اجازت صرف کاشتکاروں اور اشیاء تیار کرنے والوں کے لیے ہے یا سپلائرز بھی اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں؟ اس بارہ میں دو نقطہ نظر ہیں۔

۱۔ اکثر علماء کی رائے میں یہ رعایت تاجروں کے لیے بھی ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ بھی اسی نقطہ نظر کے حامی ہیں چنانچہ انہوں نے اس کے حق میں ”باب السلم الی من لیس عنده أصل“ ”ایسے شخص سے سلم کا معاملہ کرنا جس کے پاس اس چیز کی

اصل نہ ہو“ کے عنوان سے ایک مستقل باب باندھا ہے اور استدلال کے لیے ذیل کی روایت لائے ہیں۔

(( قَالَ عَبْدُ اللَّهِ كُنَّا نُسَلِفُ نَبِيْطَ أَهْلِ الشَّامِ فِي الْحِنْطَةِ ، وَالشَّعِيرِ ، وَالزَّيْتِ ، فِي كَيْلٍ مَّعْلُومٍ ، إِلَى أَجَلٍ مَّعْلُومٍ قُلْتُ إِلَى مَنْ كَانَ أَصْلُهُ عِنْدَهُ قَالَ مَا كُنَّا نَسْأَلُهُمْ عَنْ ذَلِكَ ))

[صحیح بخاری: باب السِّلْمِ إِلَى مَنْ لَيْسَ عِنْدَهُ أَصْلٌ]

”حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ہم شام کے کاشتکاروں کے ساتھ گندم، جو، اور تیل میں متعین پیمانے اور متعین مدت کے لیے سلم کا معاملہ کرتے: محمد بن ابی مجالد رضی اللہ عنہ کہتے ہیں میں نے پوچھا: کیا ان سے جن کے پاس ان چیزوں کی اصل ہوتی؟ انہوں نے فرمایا: ہم ان سے اس کے متعلق نہیں پوچھتے تھے۔“

حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کا مطلب ہے کہ ہم ان سے یہ نہیں پوچھتے تھے کہ تمہارے پاس گندم یا جو کی فصل ہے یا نہیں؟

اس نقطہ نظر کے حق میں دوسری روایت یہ پیش کی جاتی ہے۔

(( كُنَّا نُسَلِفُ فِي عَهْدِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَأَبِي بَكْرٍ وَعُمَرَ فِي الْحِنْطَةِ وَالشَّعِيرِ وَالزَّيْبِ أَوْ التَّمْرِ شَكَّ فِي التَّمْرِ وَالزَّيْبِ وَمَا هُوَ عِنْدَهُمْ أَوْ مَا نَرَاهُ عِنْدَهُمْ )) [مسند احمد: ۱۹۶۴]

”ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابو بکر اور عمر رضی اللہ عنہم کے دور میں گندم، جو اور منقہ یا کہا کھجوروں میں (یعنی راوی کو یہ شک ہے کہ کھجور کا لفظ بولا یا منقہ کا) بیع سلم کرتے حالانکہ وہ چیز ان کے پاس نہیں ہوتی تھی یا کہا ہم وہ ان کے پاس نہیں دیکھتے تھے“

اس نقطہ نظر کے قائلین کہتے ہیں یہ روایات اس امر کا بین ثبوت ہیں کہ سلم کی اجازت سپلائے کے لیے بھی ہے۔

۲۔ دوسری رائے یہ ہے کہ سلم کی اجازت صرف کاشتکاروں اور مینوفیکچررز کو ہے۔ ان

حضرات کی دلیل یہ ہے کہ کاشتکار اور چیز تیار کرنے والا جب سلم کے ذریعے چیز بیچتا ہے تو غالب گمان یہی ہوتا ہے مدت حوالگی کے وقت وہ چیز اس کے پاس موجود ہوگی اس کو دوسرے سے خریدنے کی ضرورت پیش نہیں آئی گی گویا وہ اپنی ملکیتی چیز بیچ رہا ہے اس کے برعکس سپلائر جب سلم کا معاہدہ کرتا ہے تو وہ چیز اس کے پاس موجود نہیں ہوتی شریعت نے غیر ملکیتی چیز کا سودا کرنے پر پابندی لگائی ہے حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

((سَأَلْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقُلْتُ يَا رَسُولَ اللَّهِ يَا أَيُّنِي الرَّجُلُ فَيَسْأَلُنِي الْبَيْعَ لَيْسَ عِنْدِي أَيْعُهُ مِنْهُ ثُمَّ أَتَاعَهُ لَهُ مِنْ السُّوقِ))

”میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ میرے پاس ایک آدمی آتا ہے وہ مجھے ایسی چیز بیچنے کو کہتا ہے جو میرے پاس نہیں ہوتی کیا میں اس کو بیچ دوں پھر وہ بازار سے خرید کر اس کو دے دوں۔“

اس پر آپ نے فرمایا:

((لَا تَبِعْ مَا لَيْسَ عِنْدَكَ)) [سنن النسائي: باب بَيْعِ مَا لَيْسَ عِنْدَ الْبَائِعِ]

”جو چیز تیرے پاس نہیں وہ فروخت نہ کر۔“

ان حضرات کے خیال میں حضرت حکیم رضی اللہ عنہ کا سوال تجارت میں سلم کے متعلق ہی تھا مگر آپ نے اس کی اجازت نہ دی اور نہ ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا کہ اگر اس کی صفات بیان کر دی گئی ہوں تو پھر جائز ہے۔ ان حضرات کی تحقیق میں جو روایات اول الذکر فریق نے پیش کی ہیں وہ ان کے موقف کے ثبوت کے لیے ناکافی ہیں۔ پہلی روایت کا مفہوم صرف اتنا ہے کہ خریدار کو فروخت کنندہ سے یہ پوچھنے کی ضرورت نہیں کہ آپ کے پاس کھیتی یا باغ ہے کہ نہیں۔ [بحوث فی فقہ المعاملات المالیه: ص ۱۳۴، ۱۳۷،

۱۳۹ للدكتور رفیق یونس المصری]

ان حضرات کی طرف سے دوسری روایت کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ اس کا مطلب ہے کہ جو چیز سلم میں فروخت کی جا رہی ہے اس کا معاہدے کے وقت پایا جانا ضروری نہیں جیسا کہ بعض فقہاء کی رائے ہے کہ وہ چیز معاہدہ طے پانے کے دن سے قبضہ کے دن تک بازار میں دستیاب ہو۔

جو حضرات سپلائرز کو سلم کی اجازت دیتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ کے فرمان ”جو چیز تیری ملکیت میں نہیں اس کو فروخت نہ کر“ سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ تاجر سلم سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ اس ارشاد کا معنی صرف یہ ہے کہ ایسی متعین چیز فروخت نہ کر جو تیرے قبضہ میں نہ ہو بلکہ غیر کی ملکیت ہو۔ چنانچہ امام ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ اس کی تشریح میں رقمطراز ہیں:

((وَأَمَّا قَوْلُ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِحَكِيمِ بْنِ حِزَامٍ (لَا تَبِعْ مَا لَيْسَ عِنْدَكَ) فَيُحْمَلُ عَلَى مَعْنَيْنِ أَحَدُهُمَا أَنْ يَبِيعَ عَيْنًا مُعَيَّنَةً وَهِيَ لَيْسَتْ عِنْدَهُ، بَلْ مِلْكٌ لِلْغَيْرِ، فَيَبِيعُهَا ثُمَّ يَسْعَى فِي تَحْصِيلِهَا وَتَسْلِيمِهَا إِلَى الْمُشْتَرِي وَالثَّانِي أَنْ يُرِيدَ بَيْعَ مَا لَا يَقْدِرُ عَلَى تَسْلِيمِهِ وَإِنْ كَانَ فِي الذَّمَّةِ))

[اعلام الموقعين: ج ۲، ص ۴۶]

”حکیم بن حزام سے نبی ﷺ کا یہ فرمانا کہ ”جو چیز تیری ملکیت میں نہیں وہ فروخت نہ کر، اس کو دو معنوں پر محمول کیا جائے گا۔

- ۱۔ انسان ایسی متعین چیز بیچے جو اس کے پاس موجود نہ ہو بلکہ غیر کی ملکیت ہو۔ آدمی پہلے اس کو بیچے پھر حاصل کر کے مشتری کے حوالے کرنے کی کوشش کرے۔
- ۲۔ ایسی چیز کا سودا کرے جس کو (مشتری کے) حوالے نہ کر سکتا ہو خواہ ذمہ داری اٹھائے۔“

بیع سلم میں دونوں باتیں نہیں ہوتیں کیونکہ یہاں تو صرف بیان شدہ صفات کے

مطابق ایک چیز فروخت کرنے کی ذمہ داری قبول کی جاتی ہے۔

اسلامی بینکوں میں سلم کا استعمال:

بلاشبہ سلم ایک بہترین غیر سودی طریقہ تمویل ہے جو عصر حاضر میں بھی لوگوں خصوصاً کاشتکاروں اور مینوفیکچررز کی مالی ضرورتیں پوری کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتا ہے اور بعض اسلامی بینک اس سے فائدہ بھی اٹھا رہے ہیں۔ لیکن ہمارے ہاں اسلامی بینک اس کی عملی تطبیق میں گڑبڑ کرتے ہیں جس سے یہ معاملہ شرعی اصول کے مطابق نہیں رہتا۔ وہ یوں کہ گنے کے سیزن میں شوگر ملوں کو گنا خریدنے کے لیے رقم کی ضرورت ہوتی ہے۔ ملز مالکان چاہتے ہیں کہ ہمارا مقصد بھی پورا ہو جائے اور ہم سود سے بھی محفوظ رہیں اب وہ اسلامی بینک کی طرف رجوع کرتے ہیں بینک اس شرط پر رقم فراہم کرتا ہے کہ آپ نے ہمیں اس کے عوض فلاں تاریخ تک اتنی چینی مہیا کرنی ہے یعنی بینک سلم کا معاہدہ کر لیتا ہے شوگر ملز کی طرف سے فراہمی یقینی بنانے کے لیے بینک ضمانت بھی طلب کرتا ہے چونکہ بینک کاروباری ادارہ نہیں جو آگے بچھنے کے لیے گاہگ تلاش کرتا پھرے اس لیے معاہدے کے وقت ہی یہ بھی طے کر لیا جاتا ہے کہ مل مالک بینک کے وکیل کی حیثیت سے یہ چینی مارکیٹ میں اس قیمت پر فروخت کر کے رقم بینک کے سپرد کرے گا۔ بعض دفعہ معاہدے کے وقت اس کی صراحت نہیں ہوتی مگر فریقین کے ذہن میں یہی ہوتا ہے۔ اگر شوگر مل بروقت چینی فراہم نہیں کرتی تو بینک دی گئی رقم کے فیصد کے حساب سے جرمانہ وصول کرتا ہے جو بینک کی زیر نگرانی قائم خیراتی فنڈ میں جمع کروایا جاتا ہے۔

بینک کا خود قبضہ کرنے کی بجائے فروخت کنندہ کو ہی وکیل بنانا شرعی اصول کے خلاف ہے۔ چنانچہ علماء احناف کے سرخیل علامہ سرحسی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

((وَلَوْ قَالَ رَبُّ السَّلْمِ لِلْمُسْلِمِ إِلَيْهِ كُلُّ مَالِي عَلَيْكَ مِنَ الطَّعَامِ  
فَاعْزِلْهُ فِي بَيْتِكَ أَوْ فِي غَرَائِرِكَ فَفَعَلَ ذَلِكَ لَمْ يَكُنْ رَبُّ السَّلْمِ

قَابِضًا بِمَنْزِلَةِ قَوْلِهِ أَقْبِضْهُ لِي بِسَارِكٍ مِنْ يَمِينِكَ وَهَذَا لِأَنَّ الْمُسْلِمَ فِيهِ دَيْنٌ عَلَى الْمُسْلِمِ إِلَيْهِ وَالْمَدْيُونُ لَا يَصْلُحُ أَنْ يَكُونَ نَائِبًا عَنْ صَاحِبِ الدَّيْنِ فِي قَبْضِ الدَّيْنِ مِنْ نَفْسِهِ)) [المبسوط: ج ۱۵ ص ۱۰۱]

”اس کا مطلب یہ ہے کہ سلم کے ذریعے بیچی گئی چیز فروخت کنندہ کے ذمہ ادھار ہوتی ہے اور جس کے ذمہ ادھار ہو وہ خود اپنی ذات سے اس کی وصولی کے لیے اس شخص کا وکیل نہیں بن سکتا جس کا اس کے ذمہ ادھار ہو۔“

علامہ ڈاکٹر محمد سلیمان الاشرق سلم سے اسلامی بینکوں کے فائدہ اٹھانے کے طریقہ کار کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

((الطريقة الثانية: أن يوكل المصرف البائع (المسلم اليه) بتسويق البضاعة بأجر أو دون أجر فإن كان باتفاق معه مسبقاً مربوط بعقد السلم نفسه فإن ذلك باطل لا يجوز، لأنه من باب جمع عقدين في عقد واحد. وكذا لو كان الأمر متفاهماً عليه أن يتم بهذه الصورة.))

[بحوث فقيهية في قضايا اقتصادية معاصرة: ج ۱ ص ۲۱۴]

”دوسرا طریقہ یہ ہے کہ بینک چیز کی مارکیٹنگ کے لیے فروخت کنندہ کو ہی اپنا وکیل مقرر کر دے خواہ اس کی اجرت دے یا نہ دے۔ تو اگر یہ وکالت پہلے سے عقد سلم سے مربوط ایگریمنٹ کے ذریعے ہو تو یہ عمل باطل ہوگا جو جائز نہیں کیونکہ یہ ایک عقد میں دو عقد جمع کرنے کے مترادف ہے اور اگر (ایگریمنٹ تو نہ ہو مگر) پہلے ہی سے ذہن میں یہ ہو کہ معاملہ اس طرح تکمیل کو پہنچے گا تو پھر بھی یہ جائز نہیں۔“

مزید لکھتے ہیں۔

”لیکن جب سامان پر بینک کا قبضہ مکمل ہو جائے اور فریقین کے درمیان ہر قسم کے تعلقات بھی ختم ہو جائیں پھر فروخت کنندہ کو ایجنٹ بنایا جائے تو یہ بعض فقہاء کے نزدیک جائز ہے مگر ہماری رائے میں بینک کو اس تکنیک سے پرہیز ہی کرنا چاہیے



کیونکہ اس طرح تجارتی سرگرمیوں میں بینک کا کردار کم ہو رقم کے لین دین پر فائدہ اٹھانے تک محدود ہو جائے گا۔ [حوالہ مذکورہ]

سلم متوازی:

یہاں یہ بتا دینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی بینکوں میں سلم سے فائدہ اٹھانے کا جو طریقہ اسلامی بینکنگ کے ماہرین نے تجویز کیا ہے اس کو سلم متوازی کہتے ہیں۔ یعنی بینک کسی تیسرے فریق کے ساتھ سلم کا معاہدہ کر لے۔ جس کی تاریخ ادائیگی پہلی سلم والی ہی ہو۔ متوازی سلم میں مدت کم ہونے کی وجہ سے قیمت زیادہ ہوگی اور یوں دونوں قیمتوں میں فرق بینک کا نفع ہوگا۔ مگر ہمارے ہاں اسلامی بینکوں میں یہ طریقہ شاذ و نادر ہی استعمال کیا جاتا ہے۔ زیادہ تر فروخت کنندہ کو ایجنٹ بنانے کا طریقہ ہی اختیار کیا جاتا ہے۔ جو شرعاً درست نہیں۔

اِسْتِصْنَاع: (Manufacturing Contract)

عقد استصناع بھی اسلامی بینکاری کی اساس شمار ہوتا ہے۔

استصناع کا معنی ہے ”آرڈر پر کوئی چیز تیار کروانا۔“ مثلاً لکڑی کے گارگیر کو یہ کہنا کہ وہ فلاں قسم کی لکڑی سے ان صفات کا حامل فرنیچر تیار کر دے استصناع کہلاتا ہے۔ اگر کسی کے پاس پہلے سے تیار فرنیچر موجود ہو اور وہ اسے فروخت کرے تو یہ استصناع نہیں بلکہ عام بیع ہوگی۔ یعنی استصناع میں تیار کر کے دینا شرط ہے لیکن بیع میں یہ شرط نہیں۔ اس ضمن میں یہ بات بھی ذہن نشین رہنی چاہیے کہ ضروری نہیں فروخت کنندہ وہ چیز خود تیار کر کے دے بلکہ وہ دوسرے سے بھی تیار کروا سکتا ہے۔

استصناع میں یہ ضروری ہے کہ میٹیریل تیار کنندہ / فروخت کنندہ کے ذمہ ہو۔ اگر میٹیریل گا ہگ خود مہیا کرے تو یہ اجارہ ہوگا نہ کہ استصناع۔

اگر تیار کنندہ طے شدہ اوصاف کے مطابق تیار کرے تو آرڈر دینے والا اسے قبول کرنے کا پابند ہوگا۔ لیکن اگر تیار کی گئی چیز طے شدہ اوصاف کے مطابق نہ ہو تو خریدار کو

یہ اختیار حاصل ہوتا ہے کہ وہ اسے دیکھنے کے بعد مسترد کر دے چاہے پہلے یہ وضاحت نہ بھی کی ہو۔

استصناع اور سلم میں فرق:

\* استصناع ہمیشہ ان چیزوں پر ہوتا ہے جن کو تیار کرنے کی ضرورت ہو جبکہ سلم سب چیزوں میں ہو سکتی ہے خواہ تیار کرنے کی ضرورت ہو یا نہ ہو۔

\* سلم میں مکمل قیمت پیشگی ادا کرنا لازمی شرط ہے جبکہ استصناع میں پہلے بھی ادا کی جاسکتی ہے اور بعد میں بھی۔

استصناع کی بنیاد پر بینکاری:

اس کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔

۱۔ جو شخص بینک یا مالیاتی ادارے سے رقم حاصل کرنے کا خواہشمند ہے اگر وہ مینوفیکچرر ہے تو بینک یا مالیاتی ادارہ بحیثیت خریدار اس کے ساتھ استصناع کا معاہدہ کر سکتا ہے۔

اس کا طریقہ یہ ہوگا کہ بینک رقم کے ضرورت مند مینوفیکچرر کو یہ آرڈر دے گا کہ وہ اس کے لیے ان صفات کی حامل فلاں چیز تیار کر دے۔ قیمت اور حوالگی کی مدت فریقین کی باہمی رضامندی سے آرڈر کے موقع پر ہی طے ہو جائے گی اور بینک کی جانب سے دی گئی رقم اسکی پیشگی قیمت تصور ہوگی۔ جب مطلوبہ چیز تیار ہو جائیگی تو بینک اس کو نفع پر مارکیٹ میں فروخت کرے گا۔ یوں مینوفیکچرر کی ضرورت بھی پوری ہو جائیگی اور بینک کو بھی اپنا سرمایہ مع نفع واپس مل جائے گا۔ لیکن اگر بینک خود فروخت کرنے کی بجائے مینوفیکچرر سے ہی معاہدہ کر لے یا معاہدہ تو نہ ہو مگر ذہن میں یہی ہو کہ وہ اس کے ایجنٹ کی حیثیت سے یہ چیز فروخت کر کے رقم اس کے حوالے کرے گا تو یہ جائز نہیں ہوگا کیونکہ اس صورت میں بینک کا کردار صرف یہ ہوگا کہ وہ مالیاتی ثالثی کے ذریعے نفع لے۔ ظاہر ہے

یہ طریقہ رقم کے لین دین پر نفع حاصل کرنے کے ہی مترادف ہے لہذا یہ جائز نہیں ہے۔

۲۔ استصناع کی بنیاد پر بینکاری کی دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ جن کلائنٹ کو آلات خریدنے، گھریا بلڈنگ کی تعمیر کے لیے رقم کی ضرورت ہو بینک انہیں طے شدہ صفات کے مطابق آلات یا گھر اور بلڈنگ تعمیر کر کے فراہم کرنے کا معاہدہ کر سکتا ہے جس کی قیمت بینک اقساط میں وصول کرے گا۔ یہاں یہ بھی یاد رہے کہ بینک کسی تیسرے فریق سے متوازی استصناع کا معاہدہ کر کے بھی آلات تیار یا گھر اور بلڈنگ تعمیر کروا سکتا ہے۔ لیکن یہ ضروری ہے کہ دونوں معاہدوں کے درمیان کوئی باہمی ربط نہ ہو۔ نیز کلائنٹ کو قبضے کا ایجنٹ بنانا یا تعمیر کی نگرانی سونپنا بھی صحیح نہیں کیونکہ گزشتہ صورت کی طرح یہاں بھی بینک کا کام صرف یہ ہوگا کہ وہ رقم دے کر طے شدہ نفع وصول کرے جو درست نہیں۔ علامہ محمد سلیمان الاشر فرماتے ہیں۔

”لکن ینبغی الحذر فی أسلوب الاستصناع المتوازی من الربط بین العقدين، أو من توکیل المشتري طالب السلعة بالتعاقد علی استصناعها، أو قبضها أو الاشراف علی صناعتها أو قیامه بشيء من الأدوار التي تقلص دور المصرف فی العملية مما یحول العملية الی مجرد قرض بفائدة“

[بحوث فقیہہ فی قضایا اقتصادیہ معاصرہ ج ۱ ص ۲۴۱]

”استصناع متوازی میں دونوں معاہدوں کے باہمی ربط، یا خریدار کو متوازی استصناع کے معاہدے کا وکیل بنانے، یا اس پر قبضہ کرنے، یا تعمیر کی نگرانی کرنے، یا کوئی ایسا کردار سونپنے جس سے بینک کا کردار سکڑ کر صرف رقم کے لین دین پر نفع حاصل کرنے تک محدود ہو جائے سے پرہیز کرنا چاہیے۔“

مروجہ اسلامی بینکوں کا طریقہ:

اسلامی بینکوں کی دوسری پراڈکٹس کی طرح یہ پراڈکٹ بھی سقم سے خالی نہیں ہے۔

مروجہ اسلامی بینک عموماً ملبوسات تیار کنندگان کے ساتھ یہ معاملہ کرتے ہیں مگر اس طرح کہ بینک نہ تو سامان قبضہ میں لیتا ہے اور نہ ہی خود آگے بیچتا ہے بلکہ کلائنٹ سے ہی یہ معاہدہ کر لیا جاتا ہے کہ وہ بینک کے ایجنٹ کی حیثیت سے ان ملبوسات کو فروخت کر کے پیسے بینک میں جمع کرائے گا۔ گویا بینک رقم دے کر رقم ہی واپس لیتا ہے اور اس پر نفع کماتا ہے اس تکنیک سے چونکہ بینک کا کردار رقم کے لین دین پر نفع حاصل کرنے تک محدود ہو جاتا ہے اس لیے یہ جائز نہیں جیسا کہ سطور بالا میں علامہ سلیمان اشقر کے حوالے سے بیان ہوا ہے۔

گارنٹی پر کمیشن کا حکم:

روایتی بینکوں کی طرح اسلامی بینک بھی گارنٹی لیٹرز جاری کرتے ہیں کیونکہ یہ لوگوں کی واقعی ضرورت بھی ہے اور بینکوں کی آمدن کا ایک ذریعہ بھی۔

گارنٹی لیٹر کو اردو میں ”ضمانتی خط“ اور عربی میں ”خطاب الضمان“ کہتے ہیں۔ اس کا اصطلاحی مفہوم یوں بیان کیا جاسکتا ہے۔

”کلائنٹ کی درخواست پر بینک کی جانب سے جاری کی گئی وہ دستاویز جس میں بینک یہ وعدہ کرتا ہے کہ وہ اس کلائنٹ کی طرف سے اتنی رقم فلاں فریق کو ادا کرنے کا ضامن ہے۔“

بینک ہمیشہ مکمل سیکورٹی حاصل کر کے ہی گارنٹی جاری کرتا ہے۔ سیکورٹی کا کتنے فیصد نقد کی شکل میں ہو اور کتنے فیصد جائیداد، مالیاتی کاغذات یا سونے کی صورت میں یہ بینک کی صوابدید پر منحصر ہوتا ہے۔ نقد کے علاوہ بینک صرف وہی چیزیں بطور سیکورٹی قبول کرتا ہے جن کی قیمت مستحکم رہنے یا بڑھنے کا امکان ہو اور وہ آسانی سے فروخت ہو سکتی ہوں۔ گارنٹی لیٹر کے عوض بینک کو درج ذیل فوائد حاصل ہوتے ہیں۔

✽ کمیشن جو مدت اور فیصد کے حساب سے ہوتی ہے۔ آج کل 0.40 فیصد فی سہ ماہی

سالانہ 1.60 فیصد ہے۔

✽ اگر بینک کو گارنٹی کی رقم ادا کرنی پڑے تو اس پر سود لیا جاتا ہے۔

✽ بطور سیکورٹی رکھی ہوئی رقم بھی استعمال کی جاتی ہے۔

سود کی حرمت تو واضح ہے مگر گارنٹی پر کمیشن بھی جائز نہیں۔ کیونکہ شرعی نقطہ نظر سے گارنٹی رضا کارانہ طور پر بغیر معاوضہ کے کیا جانے والا کام ہے اس لیے کہ قرض دینا بذات خود ایسا عمل ہے جس پر نفع یا اجرت طلب کرنا جائز نہیں ہے جب قرض پر اجرت کا مطالبہ صحیح نہیں تو اس کی ضمانت پر کیسے صحیح ہو سکتا ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ ضمانت میں یہ امکان بھی ہوتا ہے کہ ادائیگی ضامن کو کرنی پڑ جائے اس صورت میں یہ رقم اصل شخص کے ذمہ قرض ہوتی ہے اور قرض کے بدلے ہر فائدہ سود شمار ہوتا ہے اس طرح یہ کمیشن سود بن سکتا ہے اسی لیے تمام فقہاء اس پر متفق ہیں کہ ضمانت کی اجرت جائز نہیں ہے۔

سعودی عرب کے کبار علماء پر مشتمل بورڈ نے اس کے ناجائز ہونے کی ایک وجہ یہ بھی بیان کی ہے کہ:

”بطور کور (غطاء) جمع کروائی گئی رقم رہن کی حیثیت رکھتی ہے۔ ضامن (بینک) کا اس

سے فائدہ حاصل کرنا حرام ہے۔“ [أبحاث هيئة كبار العلماء ج ۵، ص: ۲۸۳]

ایک توجیہ کا جواب:

ڈاکٹر عمر بن عبدالعزیز المتمرک رحمۃ اللہ علیہ کی رائے میں:

”جب گارنٹی مکمل ادائیگی کے بدلے حاصل کی گئی یا فل کور (بغطاء کامل) ہو تو

بینک کے لیے محنت کا معاوضہ لینے میں کوئی حرج نہیں۔ اس صورت میں بینک جو

کمیشن لے گا وہ اس کی خدمات کا معاوضہ ہوگا۔ اس کمیشن کی وہی حیثیت ہے جو

بینک ڈرافٹ پر لی جاتی ہے کیونکہ یہ صورت نہ تو قرض کی ہے اور نہ ہی قرض کی شکل

اختیار کرنے کا کوئی امکان ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس صورت میں بینک نے اپنی

طرف سے ادائیگی تو نہیں کرنی بلکہ اس نے اس مال سے ادائیگی کرنی ہے جو اس

شخص نے رکھوایا ہے جس کی بینک گارنٹی دے رہا ہے۔“

[الربا و المعاملات المصرفية، ص ۳۹۱]

اس کا مطلب ہے کہ جب گارنٹی فل کور ہوگی تو بینک کلائنٹ کا ضامن ہونے کی بجائے مزدور ہوگا جسکی ڈیوٹی یہ ہوگی کہ وہ رقم اپنے پاس محفوظ رکھے اور بوقت ضرورت تیسرے فریق کو ادائیگی کرے جبکہ کمیشن حق محنت ہوگا۔

مگر یہ توجیہ تب صحیح ہو سکتی ہے جب بینک یہ کمیشن رقم اور مدت کو ملحوظ رکھ کر طے نہ کریں جیسا کہ بینکوں کا طریقہ ہے اور نہ ہی یہ معاوضہ مارکیٹ میں اس جیسی خدمات پر لی جانے والی اجرت سے زائد ہو۔ ورنہ یہ ضمانت پر اجرت اور سود لینے کا حیلہ سمجھا جائے گا۔  
اسلامی بینکوں کا پیش کردہ حل:

موجودہ اسلامی بینکوں میں حیلہ ہی کیا جاتا ہے وہ یوں کہ اسلامی بینکوں نے گارنٹی کی رقم کے مختلف سلیب اور ہر سلیب کی کمیشن کا الگ الگ ریٹ مقرر کیا ہوا ہے اور روایتی بینکوں ہی کی طرح یہ کمیشن مدت کے حساب سے ہوتی ہے۔ مثلاً البر کہ اسلامی بینک کے سلیب اور ان کا ریٹ یوں ہے۔

- ✽ گارنٹی پانچ لاکھ تک مالیت کی ہو تو کمیشن پندرہ سو فی سہ ماہی۔ یعنی سالانہ چھ ہزار۔
- ✽ پانچ سے دس لاکھ تک مالیت کی ہو تو ساڑھے تین ہزار فی سہ ماہی سالانہ چودہ ہزار۔
- ✽ دس سے پندرہ لاکھ مالیت کی ہو تو فی سہ ماہی پانچ ہزار۔ سالانہ بیس ہزار بنتی ہے۔

اسلامی بینکوں کے نزدیک یہ گارنٹی کی کمیشن نہیں ہے بلکہ یہ اس محنت کا معاوضہ ہے جو اسلامی بینک نے گارنٹی لیٹر جاری کرنے کے حوالے سے کی ہے۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو اس کی حیثیت ایک حیلے سے زیادہ نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ پانچ کی بجائے چھ لاکھ یا تین کی بجائے چھ ماہ لکھنے میں کونسی اضافی محنت خرچ ہوئی ہے جو بینک ڈیڑھ سے دو ہزار اضافی طلب کر رہا ہے۔ اسلامی بینکاری کے حامی اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ معاوضہ کام کی نوعیت کے اعتبار سے لیا جاتا ہے۔ بعض دفعہ معمولی مشقت پر زیادہ جبکہ زیادہ

محنت پر کم معاوضہ ملتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ بلاشبہ معمولی محنت پر زیادہ اجرت ممنوع نہیں ہے مگر اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ قرض اور ضمانت کی دستاویز لکھنے کا معاوضہ بھی رقم کی مقدار اور مدت کے تناسب سے طے کیا جاسکتا ہے درست نہیں ہے کیونکہ شرعی اعتبار سے قرض اور ضمانت کا معاوضہ طلب کرنا ناجائز ہے۔ جب ہم ان کی دستاویز کے معاوضے کو سودی طریقہ کار کے تحت رقم اور مدت سے منسلک کر دیں گے تو یہ قرض اور ضمانت کی اجرت کے ہی مترادف ہوگا۔

اگر اسلامی بینکوں کے مطابق اس کو دفتری امور کی اجرت ہی تسلیم کر لیا جائے تب بھی یہ جائز نہیں بنتی کیونکہ ”المعايير الشرعية“ میں دفتری امور کے معاوضے کو اسی صورت جائز قرار دیا گیا ہے جب وہ اجرت مثل سے زائد نہ ہو۔ [ص ۶۱]

یعنی گارنٹی لیٹر جیسی دستاویز تیار کرنے کی جتنی اجرت مارکیٹ میں لی جاتی ہے اس سے زائد نہ ہو۔ مگر یہ معاوضہ نہ صرف اجرت مثل سے زائد ہے بلکہ روایتی بینکوں کی کمیشن کی قریب قریب اور بعض صورتوں میں اس سے کافی زیادہ ہے مثلاً آپ روایتی بینک سے تین ماہ کیلئے دو لاکھ مالیت کی گارنٹی حاصل کریں تو موجودہ ریٹ کے مطابق آٹھ صد کمیشن ادا کریں گے۔ لیکن یہی گارنٹی اسلامی بینک ڈیڑھ ہزار کے عوض جاری کرتا ہے۔ علاوہ ازیں سودی بینکوں کی طرح اسلامی بینک بھی بطور کور جمع کروائی گئی رقم استعمال کرتے ہیں شرعاً یہ درست نہیں۔

ایل سی کھولنے کا طریقہ:

ایل سی Letter of Credit کا مخفف ہے۔ اردو میں اس کو ”تجارتی اعتباری

خط“ اور عربی میں ”الاعتماد المستندی“ یا ”خطاب الاعتماد“ کہتے ہیں۔

بینکاری اصطلاح میں ایل سی سے مراد۔

”ایسی دستاویز ہے جو درآمد کنندہ کا بینک برآمد کنندہ کے بینک کو جاری کرتا ہے اس

میں بینک برآمد کنندہ کو یہ یقین دلاتا ہے کہ وہ درآمد کنندہ کے نام جو بل جاری کرے

گا اس کی ادائیگی کر دی جائے گی۔“

یہاں درآمد کنندہ کا بینک حسب ذیل خدمات انجام دیتا ہے۔

✽ درآمد کنندہ کے ایجنٹ کی حیثیت سے درآمد کنندہ کے ساتھ معاملات طے کرتا ہے  
درآمد کنندہ کے کاغذات درآمد کنندہ تک اور اس کے درآمد کنندہ تک پہنچاتا ہے۔ اور  
اس کی باقاعدہ فیس لیتا ہے۔ شرعا اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

✽ اس بات کی ضمانت اٹھاتا ہے کہ اگر درآمد کنندہ نے ادائیگی نہ کی تو وہ کرے گا اسکی  
بھی فیس لیتا ہے یہ ناجائز ہے۔ کیونکہ شرعی اعتبار سے ضمانت کی اجرت لینا جائز  
نہیں ہے جیسا کہ اوپر بیان ہوا ہے۔

✽ اکثر درآمد کنندگان بینک سے مالیات کی سہولت بھی حاصل کرتے ہیں اس پر بینک  
بالعموم سود لیتا ہے جو کہ قطعاً حرام ہے۔

ایل سی کا صحیح حل اور اسلامی بینک:

ایل سی کا صحیح حل تو یہ ہے کہ:

✽ اگر درآمد کنندہ نے بینک سے مالیات کی سہولت حاصل نہ کی ہو تو بینک صرف ایل سی  
جاری کرنے پر آنے والے حقیقی اخراجات اور اس حوالے سے دفتری امور انجام دینے  
پر اپنی محنت کا معاوضہ ہی طلب کرے۔ تاہم یہاں اس شرط کا خیال رکھنا نہایت  
ضروری ہے جو قبل ازیں گارنٹی لیٹر جاری کرنے کے معاوضے کے حوالے سے بیان ہو  
چکی ہے کہ یہ معاوضہ رقم کی مقدار اور مدت کے تناسب سے طے نہ کیا جائے۔

✽ اور اگر درآمد کنندہ بینک سے مالیات کی سہولت بھی حاصل کرے تو یہ معاملہ مضاربہ یا  
شراکت کی بنیاد پر کیا جائے۔ یعنی جب مکمل ادائیگی بینک کی طرف سے ہو تو بینک  
سرمایہ لگانے کی بنا پر رب المال اور درآمد کنندہ مضارب ہوگا۔ اور جب کچھ ادائیگی  
درآمد کنندہ اور کچھ بینک کرے تو دونوں باہم شریک ہوں گے۔ اور دونوں صورتوں میں  
فروخت کے بعد جو نفع حاصل ہو وہ آپس میں طے شدہ تناسب سے تقسیم کر لیا جائے۔



مگر اس کے برعکس مروجہ اسلامی بینکوں میں ایل سی کے معاملات بالعموم بایں صورت انجام پاتے ہیں کہ اسلامی بینک پہلے اصل درآمد کنندہ کو اپنا ایجنٹ بنا کر اس کی وساطت سے وہ چیز خود درآمد کرتا ہے پھر مرابحہ کے ذریعے اس کو بیچ دیتا ہے ایل سی کی فیس وغیرہ نفع میں شامل کر لیتا ہے لیکن درج ذیل وجوہ کے باعث یہ طریقہ درست نہیں ہے۔

(i) اسلامی بینکوں میں رائج مرابحہ بذات خود ناجائز ہے۔ تفصیل گزشتہ صفحات میں بیان ہو چکی ہے۔ خصوصاً خریداری کے لیے کلائنٹ کو ہی ایجنٹ بنانے کی اجازت تو اسلامی بینکاری کے حامی بھی نہیں دیتے جیسا کہ ہم ”مرابحہ“ کی بحث میں بیان کر آئے ہیں۔

(ii) بینک کی جانب سے درآمد کنندہ کو خریداری کے لیے ایجنٹ بنانے کی کارروائی بھی مصنوعی ہوتی ہے کیونکہ ایجنسی ایگریمنٹ ایل سی کھلوانے کے مرحلہ پر کیا جاتا ہے حالانکہ اس سے قبل درآمد کنندہ برآمد کنندہ کے ساتھ اپنے طور پر خریداری کے سلسلے میں معاہدہ کر چکا ہوتا ہے جس میں چیز کی قیمت، مقدار، کوالٹی اور ادائیگی کا طریقہ کار طے ہوتا ہے درآمد کنندہ اس کے ثبوت کے لیے درخواست فارم کے ساتھ Proforma Invoice بھی جمع کرواتا ہے۔ ظاہر ہے بنیادی معاملات طے پانے کے بعد درآمد کنندہ کو خریداری کا ایجنٹ بنانا ایک مصنوعی کارروائی کے سوا کچھ نہیں ہے۔

(iii) اس تکنیک میں مرابحہ کی بعض ایسی شرطیں بھی پوری نہیں کی جاتیں اور نہ ہی بینک کیلئے ان کو پورا کرنا ممکن ہوتا ہے جن کو موجودہ اسلامی بینکوں کے شریعہ سکالرز بھی ضروری قرار دیتے ہیں۔ مثلاً:

✽ ابھی تک درآمد کنندہ اور برآمد کنندہ کے درمیان سودا طے نہ پایا ہو۔ اگر ایسا ہو چکا ہو تو اس کو کلی طور پر ختم کرنا ضروری ہے۔ اس میں یہ بھی شرط ہے کہ فریقین کی طرف

سے سودے کی واپسی حقیقی ہو صرف ظاہری واپسی کافی نہیں ہے۔

✽ بینک پر واجب ہے کہ وہ یہ بھی یقین کر لے کہ فروخت کنندہ خود کلائنٹ، اس

کا ایجنٹ یا اس کا ملکیتی ادارہ تو نہیں ہے۔ [المعايير الشرعية ص: ۱۰۹]

بینک یہ اطمینان کس طرح کرتا ہے اسلامی بینکاری کے شریعہ سکالرز کے پاس اس کا کوئی تسلی بخش جواب نہیں ہے۔

پراپیگنڈہ کا جواب:

مروجہ اسلامی بینکوں کے حامی یہ پراپیگنڈہ بھی کرتے ہیں کہ اسلامی بینکوں نے شریعہ ایڈوائزر رکھے ہوئے ہیں جو تمام امور کی نگرانی کرتے ہیں اگر اسلامی بینکوں میں شرعی اصولوں کا پورا خیال نہیں رکھا جاتا تو وہ تائید کیوں کرتے ہیں۔ ہم اس سلسلے میں اپنی طرف سے کچھ کہنے کی بجائے اسلامی بینکاری کے حامی اور متحدہ عرب امارات میں Emirates Islamic Bank کے شریعہ بورڈ کے ممبر جناب عبدالعظیم ابوزید کے ایک بیان کا حوالہ دینا چاہیں گے جو ۱۵ اپریل ۲۰۰۸ء کو I.B.F Net پر شائع ہو چکا ہے۔ اس کے مطابق انہوں نے دہی میں اسلامک فنانس فورم میں تقریر کرتے ہوئے واضح الفاظ میں کہا کہ شریعہ سکالر کرپٹ ہو چکے ہیں اور بینک صرف انہیں کے پاس جاتے ہیں جو ان کے حق میں ہوتے ہیں انہوں نے Arabian Business.Com کو انٹرویو دیتے ہوئے یہ بھی کہا کہ اسلامک فنانس سیکٹر خطرے میں ہے۔ انہوں نے کہا کہ بینک کا صرف ایک ہی مقصد ہوتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ نفع کمانا اس لحاظ سے کنونشنل اور (رانج) اسلامک فنانس میں کوئی فرق نہیں۔

خلاصہ

مذکورہ بالا تفصیل سے حسب ذیل باتیں ثابت ہوتی ہیں۔

- ✽ مروجہ اسلامی بینکاری سودی بینکاری کا ہی چربہ ہے مگر تاویلات کے ذریعے اس کو جائز ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی جا رہی ہے۔
- ✽ اسلامی بینکوں میں رائج مضاربہ، اجارہ، مراہمہ، مشارکہ، متناقصہ، تورق اور سلم شرعی مضاربہ، اجارہ اور مراہمہ وغیرہ سے مختلف ہیں۔
- ✽ فی الحال اسلامی بینکوں کی کوئی بھی پراڈکٹ شرعی اصول سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ لہذا ان سے احتراز واجب ہے۔



## تکافل

### مروجہ اسلامی انشورنس

کچھ عرصہ سے بعض مالیاتی ادارے اسلامی بینکوں کی طرز پر سود، غرر اور قمار پر مشتمل انشورنس کا متبادل نظام بڑے زور و شور سے متعارف کر رہے ہیں جس کو تکافل کا نام دیا گیا ہے۔ جو ادارہ اس کا انتظام و انصرام کرتا ہے اس کو تکافل کمپنی کہا جاتا ہے جیسے پاک کویت جنرل تکافل کمپنی یا پاک قطر فیملی تکافل کمپنی وغیرہ۔ ان کمپنیوں کے بقول یہ نظام چونکہ ہر لحاظ سے شرعی اصولوں کے عین مطابق ہے اس لیے اس کو اسلامی انشورنس بھی کہا جاتا ہے۔ چونکہ اس کام سے ان اداروں کی غرض نفع کمانا ہے اس لیے ہم اس کو تجارتی تکافل بھی کہہ سکتے ہیں۔ تکافل کا مفہوم اور شرعی تصور کیا ہے شرعی اور تجارتی تکافل میں بنیادی فرق کیا ہے نیز تجارتی تکافل کی شرعی اساس اور حکم کیا ہے؟ ذیل میں ان سوالوں کے جوابات ملاحظہ فرمائیں۔

### تکافل کا معنی و مفہوم:

ہماری معلومات کے مطابق قرآن و حدیث اور لغت کی قدیم کتب میں تکافل کا لفظ مذکور نہیں ہاں کتاب و سنت میں ایسے الفاظ ضرور استعمال ہوئے ہیں جن کا مادہ وہی ہے جو تکافل کا ہے یعنی ”کفل“ سے بنے ہیں۔ مثلاً قرآن حکیم میں حضرت مریم علیہا السلام کی کفالت اور تربیت کے حوالے سے ایک جگہ:

﴿فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُولٍ حَسَنٍ وَأَنْبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا وَكَفَّلَهَا زَكَرِيَّا﴾

[آل عمران: ۳۷]

”پھر اس کے رب نے اسے قبول کیا قبول کرنا اچھا اور زکریا کو اس کا کفیل بنایا۔“

اور دوسری جگہ:

﴿إِذْ يُلْقُونَ أَقْلَامَهُمْ أَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ﴾ [آل عمران: ۴۴]  
 ”جب وہ اپنے قلم ڈال رہے تھے کہ ان میں سے کون مریم کی کفالت کرے۔“  
 یعنی پہلی آیت میں لفظ ”كَفَّلَ كَفِيلٌ“ بنایا اور دوسری میں ”يَكْفُلُ“ کفالت  
 کرے، کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

جب دو آدمی دیوار پھلانگ کر حضرت داؤد علیہ السلام کے کمرہ میں داخل ہوئے تو ان میں  
 سے ایک نے کہا:

﴿إِنَّ هَذَا أَخِي لَهُ تِسْعٌ وَتِسْعُونَ نَعْجَةً وَلِيَ نَعْجَةً وَاحِدَةً﴾

فَقَالَ أَكْفَلْنِيهَا وَعَزَّنِي فِي الْخِطَابِ ۝ [ص: ۲۱]

”بے شک یہ میرا بھائی ہے اس کے پاس ننانوے دنبیاں ہیں اور میرے پاس ایک ہی  
 دنبی ہے تو یہ کہتا ہے وہ بھی میرے سپرد کر دے اور گفتگو میں مجھ پر غالب آجاتا ہے۔“  
 یہاں ”اَكْفَلُ سِپَرْدِ كَرْدَے“ کا لفظ آیا ہے۔

اسی طرح حدیث میں بھی اس مادہ کے مختلف الفاظ آئے ہیں۔ مثلاً نبی ﷺ کا  
 ارشاد گرامی ہے:

((أَنَا وَكَافِلُ الْيَتِيمِ فِي الْجَنَّةِ هَكَذَا)) [صحیح بخاری: کتاب

الادب، باب فضل من يعول]

”میں اور یتیم کی کفالت کرنے والا جنت میں اس طرح اکٹھے ہوں گے آپ نے

انگشت شہادت اور درمیانی انگلی کی طرف اشارہ کر کے فرمایا جیسے یہ دونوں اکٹھے ہیں۔“

البتہ لغت کی جدید کتب میں یہ لفظ زیر بحث آیا ہے۔ چنانچہ المورد میں تکافل کا

معنی: Joint liability or responsibility; solidarity ”مشترکہ ذمہ

داری یا جواب دہی؛ باہمی اتفاق؛ مقاصد اور عمل کا اتحاد“ لکھا ہے۔

معجم الطلاب میں ہے:

((تَكَافُلٌ يَتَكَافَلُ، تَكَافُلًا: تَضَامَنٌ / تَبَادُلُ الضَّمَانَةِ مَعَ غَيْرِهِ))  
 ”دوسرے کے ساتھ گارنٹی کا تبادلہ کرنا۔“

معجم لغة الفقهاء میں تکافل کا معنی و مفہوم یوں بیان ہوا ہے:

((تبادل الاعالة و النفقة و المعونة (Solidarity) الرعاية والتحمل، و منه تكافل المسلمين رعاية بعضهم بعضا بالنصح و النفقة و غير ذلك))

”کفالت، نفقہ اور اعانت کا تبادلہ (انگریزی میں سولیڈیرٹی) خیال رکھنا اور برداشت کرنا اور اسی سے تکافل المسلمین ہے۔ یعنی مسلمانوں کا ایک دوسرے کا خیر خواہی اور خرچ و غیرہ کر کے خیال رکھنا۔“

اسلام میں تکافل کی اہمیت:

اگرچہ قرآن و حدیث میں لفظ تکافل ذکر نہیں ہوا مگر ایک دوسرے کی ضرورتوں کا خیال رکھنا، خیر خواہی اور تعاون کرنا دین کا اہم مطالبہ ہے۔ سید قطب شہید رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

((ان التكافل الاجتماعي هو قاعدة المجتمع الاسلامي و الجماعة المسلمة مكلفة أن ترعى مصالح الضعفاء فيها))

[فی ظلال القرآن: ج ۱ ص ۲۱۲]

”بلاشبہ اجتماعی تکافل ہی اسلامی معاشرہ کی بنیاد ہے اور مسلمانوں کی جماعت پابند ہے کہ وہ اپنے کمزوروں کے مفادات کا خیال رکھے۔“  
 دوسری جگہ لکھتے ہیں:

((كان النظام الاسلامي كله يقوم على اساس التكافل))

[ج ۳ ص: ۴۳۳]

”اسلام کا مکمل نظام تکافل کی بنیاد پر قائم ہے۔“

ذیل میں اس موضوع کی بعض آیات اور احادیث نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم ملاحظہ ہوں:

﴿وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ يَأْمُرُونَ  
بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتُونَ  
الزَّكَاةَ وَيُطِيعُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ أُولَئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللَّهُ إِنَّ  
اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ﴾ [التوبة: ۷۱]

”مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے دوست ہیں وہ نیکی کا حکم دیتے اور  
برے کام سے روکتے ہیں اور نماز قائم کرتے اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ اور اس  
کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ تعالیٰ ضرور رحم فرمائے گا  
بے شک اللہ تعالیٰ نہایت غالب خوب حکمت والا ہے۔“

یعنی اہل ایمان کا شعار یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کے معاون و مددگار ہیں۔ تکافل  
کی روح بھی یہی ہے۔

علامہ محمد رشید رضا رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

((ولاية المؤمنين والمؤمنات بعضهم لبعض في هذه الآية تعم  
ولاية النصره، وولاية الأخوة والمودة))

[تفسیر المنارج: ۱۰ - ص ۴۷۰]

”اس آیت میں مومن مردوں اور مومن عورتوں کی جس دوستی کا ذکر ہے وہ نصرت،  
اخوت اور محبت سب دوستیوں کو شامل ہے۔“

✽ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک  
سفر میں تھے اچانک ایک شخص اپنی سواری پر آیا اور دائیں بائیں دیکھنے لگا یعنی اپنی  
ضرورت کی چیز تلاش کرنے لگا اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((مَنْ كَانَ مَعَهُ فَضْلٌ ظَهَرَ فَلْيَعُدْ بِهِ عَلَى مَنْ لَا ظَهْرَ لَهُ وَمَنْ كَانَ  
لَهُ فَضْلٌ مِنْ زَادٍ فَلْيَعُدْ بِهِ عَلَى مَنْ لَا زَادَ لَهُ)) [صحیح مسلم:

کتاب اللقطة، باب استحباب المؤاساة بفضول المال]

”جس کے پاس زائد سواری ہے وہ اس کو دے دے جس کے پاس سواری نہیں ہے اور جس کے پاس زائد راشن ہو وہ اس کو دے دے جس کے پاس راشن نہیں ہے۔ راوی کہتے ہیں آپ ﷺ نے مال کی جو اصناف ذکر کی سوکی یہاں تک کہ ہم نے یہ سمجھا کہ زائد میں ہم میں سے کسی کا حق نہیں ہے۔“

اسلام کہتا ہے اگر ایک مسلمان کو تکلیف ہو تو دنیا بھر کے مسلمان اس وقت تک بے چین رہیں جب تک اس کی تکلیف رفع نہ ہو جائے۔ آپ ﷺ نے بڑی عمدہ مثال بیان کر کے اس کو یوں سمجھایا:

((تَرَى الْمُؤْمِنِينَ فِي تَرَاحِمِهِمْ وَتَوَادُّهِمْ وَتَعَاطُفِهِمْ كَمَثَلِ الْجَسَدِ إِذَا اشْتَكَى عُضْوًا تَدَاعَى لَهُ سَائِرُ جَسَدِهِ بِالسَّهْرِ وَالْحُمَى))

→ [صحیح بخاری: کتاب الادب، باب رحمة الناس و البهائم]

”تو مسلمانوں کو ایک دوسرے پر رحم کرنے، محبت رکھنے اور شفقت کرنے میں ایک جسم کی مانند دیکھے گا اگر ایک عضو بیمار ہو جاتا ہے تو تمام اعضاء بخار اور بیداری میں اس کے شریک ہوتے ہیں۔“

ایک موقع پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا اللہ کی قسم اگر اللہ تعالیٰ یہ قحط ختم نہ کرتے:

((مَا تَرَكَتُ أَهْلَ بَيْتٍ مِنَ الْمُسْلِمِينَ لَهُمْ سِعَةٌ إِلَّا أَدْخَلْتُ مَعَهُمْ أَعْدَادَهُمْ مِنَ الْفُقَرَاءِ))

[الاداب المفرد: باب المواساة في السنة والمجاعة]

”میں ہر صاحب حیثیت مسلمان گھرانے میں اتنے ہی غرباء داخل کر دیتا۔“

یعنی ایک خوشحال خاندان میں جتنے افراد ہوتے اتنے ہی غرباء کی کفالت ان پر لازم ہوتی۔

اسلامی تکافل کی ہمہ گیریت:

اسلام کا نظام تکافل اسلامی اخوت، معاشی احتیاج و ضرورت اور تکریم انسانییت پر



استوار ہے۔ اسلام اس سوچ کا قطعاً حامی نہیں کہ ہم پر صرف ان مستحقین کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے جو ہمارے ہم عقیدہ ہوں۔ قرآن حکیم میں ارشاد ہے:

﴿لَا يَنْهَاكُمُ اللَّهُ عَنِ الَّذِينَ لَمْ يُقَاتِلُواكُمْ فِي الدِّينِ وَلَمْ يُخْرِجُواكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ أَنْ تَبَرُّوهُمْ وَتُقْسِطُوا إِلَيْهِمْ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ ۝﴾ [الممتحنة: ۸]

”اللہ تعالیٰ تمہیں ان لوگوں سے حسن سلوک کرنے اور ان کے حق میں انصاف کرنے سے نہیں روکتا جو تم سے دین کی بابت نہیں لڑے اور جنہوں نے تم کو تمہارے گھروں سے نہیں نکالا۔ بلاشبہ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔“

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

((فِي كُلِّ ذَاتِ كَبِدٍ رَطْبَةٌ أَجْرٌ)) [صحيح بخاری: كتاب المظالم

باب الآبار على الطرق إذا لم يتأذ بها]

”ہر جاندار میں ثواب ہے“ یعنی ہر جاندار کے ساتھ احسان کرنا باعث ثواب ہے۔“

فقہائے اسلام کی رائے میں جو اہل ذمہ اپنے معاش کے حصول سے عاجز ہو جائیں

ان کی ضرورت کے مطابق بیت المال سے وظیفہ جاری کیا جائے گا۔ چنانچہ امام ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ رقمطراز ہیں:

((قد روى عنه وأنه أجرى على شيخ منهم من بيت المال، وذلك

أنه مر به و هو يسأل على الابواب . و فعله عمر بن عبدالعزيز))

[احکام اهل الذمة، باب من لا يقدر من اهل الذمة أعطى من بيت المال]

”حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے ایک ذمی بوڑھے کو دروازوں پر مانگتے

دیکھا تو بیت المال سے اس کا وظیفہ جاری کر دیا اور عمر بن عبدالعزیز نے بھی ایسا کیا تھا۔“

حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے اہل حیرہ سے کہا تھا تم میں سے جو بوڑھا ہو جائے گا یا جس پر

کوئی آفت آجائے گی یا جو مالدار رہنے کے بعد غریب ہو جائے گا وہ جب تک

دارالاسلام میں رہے گا اس کی اور اس کے بیوی بچوں کی کفالت بیت المال کرے گا۔ [کتاب الخراج قاضی ابو یوسف]

ثابت ہوا اسلام کے نظام تکافل کا فیض انتہائی وسیع ہے جس سے اسلامی ریاست کا ہر مستحق شہری بلا تخصیص عقیدہ بقدر ضرورت مستفید ہوتا ہے۔

تکافل کی مختلف صورتیں:

اسلامی نقطہ نظر کے مطابق درجات معیشت میں تفاوت اپنی جگہ مگر اس طرح سادہ زندگی گزارنے کا حق سب کو یکساں ہے کہ اس کی بنیادی ضرورتیں پوری ہوتی رہیں۔ اس امر کو یقینی بنانے کے لیے زکوٰۃ، عشر اور صدقہ فطر وغیرہ کا نظام دیا گیا ہے۔ اور معاشرہ میں دولت کو زیر گردش لانے اور غرباء کی بہبود میں زکوٰۃ کا کردار بڑا نمایاں ہے۔ سید قطب شہید رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

((ان الزکاة فرع من فروع نظام التكافل الاجتماعی فی

الاسلام)) [فی ظلال القرآن: ج ۴ - ص ۴۱]

”زکوٰۃ اسلام میں تکافل اجتماعی کی شاخوں میں سے ایک شاخ ہے۔“

رمضان المبارک کے اختتام پر صدقہ فطر بھی تکافل اجتماعی کی ایک شکل ہے تاکہ چھوٹے سے لے کر بڑے تک ہر شخص فقراء و مساکین کی دیکھ بھال میں حصہ دار بنے مالداروں کو فقراء اقرباء کے نان و نفقہ کا ذمہ دار ٹھہرانا بھی تکافل میں شامل ہے جبکہ نقلی صدقات اور ہنگامی حالات میں انفاق کا حکم الگ ہے۔ اسی طرح غیر ارادی طور پر قتل ہو جانے کی صورت میں دیت تہا قاتل پر ڈالنے کی بجائے عاقلہ (قاتل کے بھائی، چچا اور ان کی اولاد) کو بھی شریک کرنے کا حکم تکافل کی ہی عکاسی کرتا ہے۔ چنانچہ علامہ ابن قدامہ حنبلی رحمۃ اللہ علیہ اس کی حکمت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

((وَالْمَعْنَى فِي ذَلِكَ أَنَّ جَنَايَاتِ الْخَطَا تَكْثُرُ، وَدِيَةَ الْآدَمِيِّ

كثِيرَةٌ، فَإِيْجَابُهَا عَلَى الْجَانِي فِي مَالِهِ يُجْحِفُ بِهِ ، فَاقْتَضَتْ  
 الْحِكْمَةُ إِيجَابَهَا عَلَى الْعَاقِلَةِ ، عَلَى سَبِيلِ الْمُوَاسَاةِ لِلْقَاتِلِ ،  
 وَالْإِعَانَةِ لَهُ ، تَخْفِيفًا عَنْهُ )) [المغنى: ج ۱۲ - ص ۲۱]  
 ”اس میں حکمت یہ ہے غیر ارادی طور پر ہونے والے جرائم بکثرت ہوتے ہیں اور  
 آدمی کی دیت بھی کافی زیادہ ہے۔ لہذا اس کو اکیلے خطا کار کے مال میں واجب  
 قرار دینا اس پر اس کے مال میں ناقابل برداشت ذمہ داری ڈالنے کا باعث ہے  
 چنانچہ حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ قاتل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے بطور ہمدردی اور  
 اعانت کے اس کی عاقلہ پر واجب قرار دی جائے۔“

بلکہ غیر ارادی قتل میں دیت کا حکم بذات خود تکافل کی ایک صورت ہے وہ یوں کہ  
 بعض دفعہ مقتول کے بچے کمسن ہوتے ہیں جن کی تعلیم و تربیت کے لیے پیسوں کی  
 ضرورت ہوتی ہے اسلام نے دیت مقرر کر کے ان کی کفالت کا انتظام کیا ہے۔  
 اس سے ثابت ہوا کہ اسلام نے تکافل کا ایک مضبوط نظام دیا ہے اگر اس پر عمل ہو  
 جائے تو تمام محتاجوں کی معاشی ضرورتیں پوری ہو سکتی ہیں۔ لیکن بایں ہمہ اگر ضرورت  
 پوری نہ ہو تو سرمایہ داروں پر مزید خرچ کرنا لازم ہو جاتا ہے۔

### اسلامی تکافل کی خصوصیت:

اسلامی تکافل کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا بنیادی مقصد اپنے مستقبل  
 کے خطرات کا تحفظ اور نقصانات کی تلافی ہرگز نہیں۔ اور نہ ہی اس کو بطور کاروبار اختیار کیا  
 جانا چاہیے اسلامی معاشرے کا یہ شعار ہونا چاہیے کہ اس کے تمام افراد باہم مددگار و معاون  
 ہوں اور ضرورت مندوں اور مجبوروں کی مدد کریں لیکن اگر کچھ ادارے تکافل کے نام  
 سے یہ مطالبہ کریں کہ ہم آپ کے بیوی بچوں کی مدد تب کریں گے جب آپ اتنے  
 سالوں تک ہر ماہ ایک متعین رقم ہمیں وکالہ یا مضاربہ کی بنیاد پر کاروبار اور وقف فنڈ میں  
 بطور چندہ دیں گے تو اس سے اسلام کے تکافل اجتماعی کا مقصد حاصل نہیں ہوگا۔

مروجہ تکافل اور اس کا طریقہ کار:

ماضی قریب میں تکافل کی ایک نئی شکل سامنے آئی ہے جس کا مقصد دوسروں کے ساتھ تعاون کی بجائے دراصل اپنے نقصان کا ازالہ ہوتا ہے اور اس کے منتظم بھی یہ کام بطور کاروبار کرتے ہیں۔ اس کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ

✽ سب سے پہلے کچھ لوگ یا مالیاتی ادارے مل کر ایک کمپنی قائم کرتے ہیں جس کو تکافل کمپنی کہا جاتا ہے کمپنی کے ادا شدہ سرمایہ کا ایک حصہ وقف کر کے ایک پول بنایا جاتا ہے یہ پول کسی کی ملکیت نہیں ہوتا بلکہ اپنا الگ قانونی وجود رکھتا ہے کمپنی کی طرف سے پول میں ڈالی گئی رقم ان متاثرین کے لیے وقف ہوتی ہے جو پالیسی حاصل کرتے ہیں۔

✽ کمپنی مالکان وقف کی اس رقم کو وقف کے ایجنٹ کی حیثیت سے یا مضاربہ کی بنیاد پر کاروبار میں لگاتے ہیں نفع سے اپنی فیس یا حصہ الگ کر کے باقی دوبارہ وقف پول میں ہی جمع کر دیا جاتا ہے۔

✽ کمپنی لوگوں کو پالیسی حاصل کرنے کی ترغیب دیتی ہے جو لوگ پالیسی حاصل کرتے ہیں وہ اس کے ممبران شمار ہوتے ہیں۔

✽ پالیسی حاصل کرتے وقت خواہش مند اپنی اغراض پیش نظر رکھتے ہیں۔ کسی کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ میری موت کے بعد میرے بچوں کی کفالت کے لیے ان کے پاس بیس لاکھ ہونا چاہیے۔ کسی کے پیش نظر خاص قسم کے متوقع نقصان کا ازالہ کرنا ہوتا ہے۔

✽ صرف وہی لوگ پالیسی حاصل کرنے کے اہل شمار ہوتے ہیں جو عمر و صحت اور انکم کے لحاظ سے کمپنی کے معیار پر پورا اترتے ہیں۔ باقاعدہ طبی معائنہ کے ذریعہ ایک اندازہ کیا جاتا ہے۔ اگر کسی چیز کے متوقع نقصان کی تلافی مقصود ہو تو اس چیز کی حالت بھی دیکھی جاتی ہے۔

\* پالیسی کی زیادہ سے زیادہ مالیت کیا ہوگی یہ فیصلہ خواہشمند نے خود کرنا ہوتا ہے۔ کم از کم مالیت تکافل کمپنی طے کرتی ہے۔

\* پالیسی کی زیادہ سے زیادہ مدت کمپنی طے کرتی ہے البتہ کم سے کم مدت کا تعین وہ شخص خود بھی کر سکتا ہے۔ یاد رہے کمپنی کی جانب سے پالیسی ہولڈر کو دی جانے والی رقم کا انحصار انہی دو باتوں پر ہوتا ہے۔

\* چونکہ تکافل فنڈ کا انتظام و انصرام کمپنی کے ذمہ ہوتا ہے کمپنی اس کی باقاعدہ فیس لیتی ہے جس کو وکالہ فیس کہا جاتا ہے۔

\* پالیسی کی رقم عموماً سالانہ اقساط میں جمع کروائی جاتی ہے جبکہ ششماہی یا سہ ماہی اقساط میں بھی کروائی جاسکتی ہے۔

\* پالیسی ہولڈر کی قسط سے سب سے پہلے ایلوکیشن فیس منہا کی جاتی ہے یہ فیس پالیسی مالیت اور مدت کو مد نظر رکھ کر لی جاتی ہے پہلی قسط سے ایک خطیر رقم اس مد میں چلی جاتی ہے۔ مثلاً اگر پالیسی کی مدت ۲۰ سال یا اس سے زیادہ ہو اور قسط پندرہ سے پچیس ہزار تک ہو تو پاک قطر فیملی تکافل پہلی سالانہ قسط سے ۸۰ دوسری سے ۲۰ تیسری سے ۱۰ چوتھی سے ۷ پانچویں سے بھی ۷ چھٹی سے لے کر دسویں تک تین فیصد وصول کرتی ہے۔

\* ایلوکیشن فیس کے بعد ہر قسط کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے ایک حصہ انوسٹمنٹ کے لیے اور دوسرا حصہ وقف پول کے لیے۔

\* جو حصہ انوسٹمنٹ کے لیے ہوتا ہے اس سے دو قسم کی فیس کاٹی جاتی ہے۔

۱۔ ایڈمن فیس: یہ ماہانہ اور پالیسی کی مالیت اور مدت کے اعتبار سے مختلف مگر فکسڈ ہوتی ہے۔ مثلاً پاک قطر فیملی تکافل کی کم از کم ۶۵ روپے اور زیادہ سے زیادہ ایک سو دس ماہانہ ہے اس میں سالانہ آٹھ فیصد اضافہ بھی ہوتا ہے۔

۲۔ مینجمنٹ انوسٹمنٹ فیس: پاک قطر فیملی تکافل کمپنی کی تقریباً ڈیڑھ فیصد ہے۔

✽ جنرل تکافل میں مکمل قسط وقف پول میں جمع ہوتی ہے۔ کمپنی وقف کو منظم کرنے اور اس کے سرمایہ سے کاروبار کرنے کی علیحدہ علیحدہ فیس لیتی ہے۔

✽ ہر تکافل کمپنی کا ایک دوسری کمپنی جس کو ری تکافل کہا جاتا ہے سے معاہدہ ہوتا ہے تکافل کمپنی پالیسی ہولڈر کی قسط کا کچھ حصہ ری تکافل کمپنی کو بھی دیتی ہے۔

✽ جو حصہ وقف پول میں جمع ہوتا ہے وہ پالیسی ہولڈرز کی ملکیت سے نکل کر وقف کی ملکیت میں چلا جاتا ہے تاہم تجارتی تکافل کے حامیوں کے مطابق وہ خود وقف نہیں ہوگا صرف وقف کی ملکیت ہوگا جو وقف کے مصالحو اور ان لوگوں پر خرچ ہوگا جو وقف کی مد میں شامل ہونگے۔ ملاحظہ ہو مولانا محمد تقی عثمانی صاحب کا مقالہ ”تأصيل التأمین

التکافلی علی أساس الوقف و الحاجة الداعية اليه“ ص: ۱۸-۲۰۔

✽ کمپنی ان دونوں کھاتوں میں جمع شدہ رقم سے پالیسی ہولڈرز اور وقف پول کے ایجنٹ کی حیثیت سے کاروبار کرتی ہے جو نفع ہو وہ وقف پول اور پالیسی ہولڈرز کے کھاتے میں جمع کر دیا جاتا ہے۔ وقف پول کا مکمل نفع وقف پول میں ہی جاتا ہے۔

✽ کلیمز کی ادائیگی میں عموماً سرمایہ دارانہ انشورنس کی شرطوں کو ہی ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ اگر کلیمز زیادہ ہونے کی وجہ سے وقف پول میں رقم کم پڑ جائے تو قانوناً کمپنی اس بات کی پابند ہوتی ہے کہ وہ قرض حسنہ لیکر باقی کلیمز ادا کرے۔ یہ قرض خود کمپنی ہی وقف پول کو دیتی ہے جو اس نے آئندہ سرپلس سے وصول پانا ہوتا ہے۔

✽ اگر پالیسی ہولڈر بیماری یا حادثے کی وجہ سے قسط ادا کرنے کے قابل نہ رہے تو وہ کمپنی ادا کرتی ہے بشرطیکہ شروع میں یہ فیصلہ کر لیا جائے کیونکہ اس کے لیے اضافی رقم ادا کرنا لازم ہوتی ہے۔

مروجہ تکافل کی قسمیں:

اس کی بنیادی قسمیں دو ہیں:

۱۔ فیملی تکافل۔

۲۔ جنرل تکافل۔

فیملی تکافل:

یہ اصطلاح لائف انشورنس کے متبادل استعمال ہوتی ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ پالیسی ہولڈر کی ہر قسط کا کچھ انوسٹمنٹ کھاتے میں جاتا ہے اور کچھ حصہ وقف پول میں۔ یہاں کمپنی دو قسم کی الگ الگ ایجنسی فیس وصول کرتی ہے ایک وقف پول کا منتظم ہونے کی حیثیت سے یہ وقف پول سے لی جاتی ہے اور دوسری پالیسی ہولڈر کا ایجنٹ ہونے کی حیثیت سے یہ پالیسی ہولڈر کے کھاتے سے کاٹی جاتی ہے۔

اب اگر پالیسی ہولڈر متعینہ مدت سے پہلے فوت ہو جائے تو کمپنی اس کے ورثاء کو ایک تو انوسٹمنٹ اکاؤنٹ میں سے پالیسی حاصل کرنے کی ابتداء سے لے کر فوت ہونے تک جمع کرائی گئی رقم مع اس نفع کے جو سرمایہ کاری سے حاصل ہوا ادا کریگی۔ اور دوسرا فوت ہونے کی وجہ سے پالیسی ہولڈر کے ذمہ جو اقساط رہ گئیں ہیں وہ وقف پول سے ادا کریگی اور اگر پالیسی ہولڈر متعینہ مدت تک زندہ رہے تو پھر اس کو حسب ذیل فوائد حاصل ہونگے۔

✽ انوسٹمنٹ کھاتے میں جمع شدہ رقم مع اس نفع کے جو اس دوران سرمایہ کاری سے حاصل ہوا۔

✽ وقف میں دیے گئے عطیہ کے تناسب سے حصہ بشرطیکہ وقف پول میں سرپلس ہو۔ لیکن اگر کوئی شخص مدت مکمل ہونے سے قبل پالیسی سے نکلنا چاہے تو وہ صرف اپنی انوسٹمنٹ کھاتے میں موجود رقم اور اس سے حاصل ہونے والے نفع کا حق رکھتا ہے وقف پول میں دی گئی رقم پر اس کا کوئی حق نہیں ہوتا۔

## جنرل تکافل:

یہ اصطلاح جنرل انشورنس کی جگہ بولی جاتی ہے۔ یعنی ممکنہ خطرات سے تحفظ کی پالیسی اس میں قسط کی پوری رقم وقف پول میں جاتی ہے۔ اگر دوران مدت وہ نقصان ہو جائے جس کی تلافی کے لیے پالیسی لی گئی ہے تو ازالہ کر دیا جاتا ہے۔ بصورت دیگر سرمایہ دارانہ نظام انشورنس کی طرح پالیسی ہولڈر کو کچھ نہیں ملتا۔ البتہ کمپنی اپنی صوابدید پر کچھ بونس دے سکتی ہے۔

## کیا مروجہ تکافل سود اور غرر سے پاک ہے؟

کمرشل انشورنس کو جن خرابیوں کی بنیاد پر حرام قرار دیا گیا ہے ان میں سرفہرست سود اور غرر (Uncertainty) ہے بادی النظر میں یہ دونوں خرابیاں یہاں بھی پائی جاتیں ہیں۔ وہ یوں کہ اگر پالیسی ہولڈر مدت پوری ہونے سے پہلے فوت ہو جائے تو اس کو پالیسی کے تحت طے شدہ رقم دی جاتی ہے، جس کا ایک حصہ اس نے ادا ہی نہیں کیا ہوتا۔ اور کمپنی قانونی طور پر اس کی پابند بھی ہوتی ہے۔ جبکہ غرر اس طرح کہ دونوں احتمال ہیں ممکن ہے جس نقصان کے ازالہ کے لیے پالیسی لی گئی ہے وہ پیش نہ آئے اور ادا کی ہوئی رقم رائیگاں جائے اور یہ بھی احتمال ہے کہ وہ پیش آجائے اور کمپنی کے ذمہ ادائیگی لازم ہو جائے۔

## کیا یہ عقد معاوضہ نہیں؟

تجارتی تکافل کے حامی کہتے ہیں کہ اضافہ اور غرر تب ممنوع ہے جب عقد معاوضہ (لین دین کی وہ صورت جس میں ایک فریق دوسرے سے معاوضہ لینے کا حق رکھتا ہے) میں ہو جبکہ یہ عقد تبرع (Donation) ہے۔ لیکن یہ توجیہ درست نہیں۔ کیونکہ پالیسی ہولڈر کو حاصل ہونے والے فوائد کا انحصار پالیسی مالیت کی کمی پیشی پر ہوتا ہے یعنی پرمیئم کم تو فائدہ بھی کم پرمیئم زیادہ تو فائدہ بھی زیادہ ہوتا ہے اور یہ سب



کچھ باقاعدہ ایک معاہدے کے تحت ہوتا ہے جس کی پابندی فریقین کے لیے لازمی ہوتی ہے اور اس کو قانونی تحفظ بھی حاصل ہے حتیٰ کہ اگر کلیمز کی ادائیگی کے لیے رقم موجود نہ ہو تو (نام نہاد) وقف قرض لے کر یہ ادائیگی ممکن بناتا ہے ایسی صورت میں اس کو عقد تبرع قرار دینا ناقابل فہم ہے۔ نیز اس پر تبرع کی تعریف بھی صادق نہیں آتی کیونکہ تبرع کا معنی ہے کسی کو کوئی چیز اس طرح دی جائے کہ معاوضے کی خواہش نہ رکھی جائے جبکہ یہاں تو محرک ہی یہ ہے کہ مجھے اس کے عوض یہ فوائد حاصل ہونگے۔

ایک تاویل کا جواب:

مروجہ تکافل کے بعض حامی اس کی یہ تاویل کرتے ہیں کہ پالیسی ہولڈر یہ فوائد دیئے گئے عطیات کی بنیاد پر نہیں بلکہ وقف کے قواعد و ضوابط کے تحت حاصل کرتا ہے یعنی وہ یہ نہیں کہتا چونکہ میں نے وقف کو اتنا چندہ دیا ہے اس لیے میں ان فوائد کا حق رکھتا ہوں بلکہ وہ یہ کہتا ہے کہ ان قواعد کی بنیاد پر مجھے یہ فوائد حاصل ہونے چاہئیں۔ یہ قانونی حق اس کو عقد معاوضہ میں داخل نہیں کرتا۔

مگر دو وجوہ کے باعث یہ تاویل بیت عنکبوت سے بھی زیادہ کمزور ہے:

۱۔ ایک تو اس لیے کہ پالیسی ہولڈر کو قواعد و ضوابط کے تحت دعویٰ کرنے کا حق بھی تو دی گئی رقم کے بدلے ہی حاصل ہوا ہے اب آپ قواعد و ضوابط کا نام لیں یا پرمیئم کی کمی بیشی کا اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

۲۔ دوسرا اس لیے کہ پالیسی ہولڈر کی نظر تو ان فوائد پر ہوتی ہے جو اس کو مستقبل میں اس کے بدلہ میں حاصل ہونا ہوتے ہیں وہ قواعد و ضوابط کے تحت حاصل ہوں یا دی گئی رقم کے عوض اس کو اس سے دلچسپی نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے لوگوں کی اکثریت پالیسی حاصل کرتے وقت فوائد کے متعلق تو پوچھتی ہے مگر وقف کے قواعد و ضوابط کے بارہ میں سوال نہیں کرتی۔ ایک مجلس میں جب راقم نے ایک مشہور تکافل کمپنی کے سنیر کنسلٹنٹ سے پوچھا کیا آپ پالیسی حاصل کرنے کے خواہش مندوں کو قواعد

وضوابط سے آگاہ کرتے ہیں تو انہوں صاف کہا کہ لوگ ہم سے صرف یہ پوچھتے ہیں کہ ہمیں کیا ملے گا قواعد و ضوابط کے متعلق کبھی سوال نہیں ہوا۔

اس سے ثابت ہوا کہ جن خرابیوں کی بنا پر روایتی انشورنس حرام ہیں تکافل ان سے پاک نہیں۔

کیا نقدی کو وقف کیا جاسکتا ہے؟

یہاں یہ بحث بھی بڑی اہم ہے کہ روپیہ پیسہ وقف کیا جاسکتا ہے یا نہیں کیونکہ تکافل کمپنی کی پوری عمارت اس پر استوار ہے، لہذا ہم اس مسئلہ کو قدرے تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔

اکثر فقہاء اور اہل علم کی رائے میں روپے پیسے اور درہم و دینار کا وقف ہی درست و جائز نہیں۔ چنانچہ فقہ حنفی کی مشہور کتاب ہدایہ کی شرح فتح القدر میں ہے:

((وَقَالَ الشَّافِعِيُّ رَحِمَهُ اللَّهُ كُلُّ مَا أُمِّنَ الْإِنْتِفَاعُ بِهِ مَعَ بَقَاءِ

أَصْلِهِ وَيَجُوزُ بَيْعُهُ يَجُوزُ وَقْفُهُ، وَهَذَا قَوْلُ مَالِكٍ وَأَحْمَدَ أَيْضًا

وَأَمَّا وَقْفُ مَا لَا يُنْتَفَعُ بِهِ إِلَّا بِالِاتِّلَافِ كَالذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ

وَالْمَأْكُولِ وَالْمَشْرُوبِ فَغَيْرُ جَائِزٍ فِي قَوْلِ عَامَّةِ الْفُقَهَاءِ،

وَالْمُرَادُ بِالذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ الدَّرَاهِمُ وَالذَّنَانِيرُ وَمَا لَيْسَ بِحُلِيِّ))

”امام شافعی رحمہ اللہ نے کہا ہے: کہ ہر وہ چیز جس کو باقی رکھ کر اس سے فائدہ حاصل

کرنا ممکن ہو اور اس کی بیع بھی جائز ہو تو اس کا وقف درست ہے یہ امام مالک اور

امام احمد کا بھی قول ہے۔ باقی اس چیز کا وقف جس کو صرف کیے بغیر اس سے استفادہ

ممکن نہ ہو جیسے سونا، چاندی اور کھانے پینے کی اشیاء ہیں تو عام فقہاء کے نقطہ نظر میں

یہ جائز نہیں ہے۔ سونے اور چاندی سے مراد درہم، دینار اور وہ سونا ہے جو زیور کی

شکل میں نہ ہو۔“

شارح بخاری علامہ ابن بطال رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

((قال ابو حنیفة و ابو یوسف لا یجوز وقف الحیوان  
والعروض والدنانیر والدرہم)) [شرح صحیح البخاری: ج ۸  
ص ۱۹۸]

”امام ابو حنیفہ اور ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ جانور، سامان اور درہم و دینار کا  
وقف جائز نہیں۔“

مشہور حنفی عالم علامہ انور شاہ کاشمیری رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

((واعلم أن وقف المنقول لا یصح علی أصل المذهب  
واجازہ محمد فیما تعارفہ الناس))

[فیض الباری ج ۳، ص: ۴۱۶]

”جان لو! اصل (حنفی) مذہب میں اشیاء منقولہ کا وقف صحیح نہیں ہے۔ مگر امام محمد رحمۃ اللہ علیہ  
نے ان چیزوں میں اس کی اجازت دی ہے جن میں لوگوں کا عرف ہو جائے۔“  
علامہ ابن قدامہ حنبلی رحمۃ اللہ علیہ رقمطراز ہیں:

((وَجُمَلْتُهُ أَنَّ مَا لَا يُمَكِّنُ الْإِنْتِفَاعُ بِهِ مَعَ بَقَاءِ عَيْنِهِ ، كَالدَّنَانِيرِ  
وَالدَّرَاهِمِ ، وَالْمَطْعُومِ وَالْمَشْرُوبِ ، وَالشَّمْعِ ، وَأَشْبَاهِهِ ، لَا  
يَصِحُّ وَقْفُهُ ، فِي قَوْلِ عَامَّةِ الْفُقَهَاءِ وَأَهْلِ الْعِلْمِ ، إِلَّا شَيْئًا  
يُحْكِي عَنْ مَالِكٍ ، وَالْأَوْزَاعِيِّ ، فِي وَقْفِ الطَّعَامِ ، أَنَّهُ يَجُوزُ  
وَلَمْ يَحْكِهِ أَصْحَابُ مَالِكٍ وَلَيْسَ بِصَحِيحٍ ؛ لِأَنَّ الْوَقْفَ  
تَحْبِيسُ الْأَصْلِ وَتَسْبِيلُ الثَّمَرَةِ ، وَمَا لَا يُنْتَفَعُ بِهِ إِلَّا بِالِاتِّلَافِ  
لَا يَصِحُّ فِيهِ ذَلِكَ)) [المغنی: ج ۸، ص: ۲۲۹]

”اس کا مفہوم یہ ہے کہ جس چیز کو باقی رکھ کر اس سے فائدہ اٹھانا ممکن نہ ہو جیسے  
درہم و دینار، کھانا، مشروب، شمع اور اس جیسی دوسری اشیاء عام فقہاء اور اہل علم کے

نزدیک ان کا وقف درست نہیں ہے۔ البتہ امام مالک اور امام اوزاعی رضی اللہ عنہما سے کھانے کے وقف کے متعلق مروی ہے کہ یہ جائز ہے (اس کو امام مالک کے شاگردوں نے بیان نہیں کیا) لیکن یہ درست نہیں کیونکہ وقف کا مطلب ہے ”اصل کو باقی رکھنا اور اس کے فائدہ کو اللہ کی راہ میں خیرات کرنا“ اور جس کو تلف کیے بغیر اس سے فائدہ لینا ممکن نہ ہو اس میں وقف صحیح نہیں ہوتا۔“

مزید لکھتے ہیں:

((وَجُمْلَةٌ ذَلِكَ أَنَّ الَّذِي يَجُوزُ وَقْفُهُ، مَا جَازَ بَيْعُهُ، وَجَازَ الْإِنْتِفَاعُ بِهِ مَعَ بَقَاءِ عَيْنِهِ، وَكَانَ أَصْلًا يَبْقَى بَقَاءً مُتَّصِلًا، كَالْعَقَارِ وَالْحَيَوَانَاتِ، وَالسَّلَاحِ، وَالْأَثَاثِ، وَأَشْبَاهِ ذَلِكَ))

[المغنی ج ۸ ص: ۲۳۱]

”وقف اس کا جائز ہے جس کی بیع اور اس کو بعینہ باقی رکھ کر اس سے فائدہ اٹھایا جا سکے۔ اور وہ ایسی چیز ہو جو متصل باقی رہے جیسے زمین، جانور، اسلحہ، اثاثہ اور اس قسم کی دوسری اشیاء ہیں“

علماء و فقہاء کا موقف تو آپ اوپر ملاحظہ کر چکے ہیں، البتہ بعض اہل علم وہ بھی ہیں جو رقم کو بھی وقف کرنا جائز سمجھتے ہیں۔ ان میں امام بخاری رضی اللہ عنہ بھی شامل ہیں۔ چنانچہ انہوں نے اس کے حق میں عنوان بھی قائم کیا ہے۔

((بَابُ وَقْفِ الدَّوَابِّ وَالْكُرَاعِ وَالْعُرُوضِ وَالصَّامِتِ))

[صحیح البخاری، کتاب الوصایا]

”جانوروں، گھوڑوں، سامان اور سونے، چاندی کے وقف کا بیان۔“

اپنے موقف پر استدلال کے لیے انہوں نے اس باب کے تحت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ

واقعہ نقل کیا ہے:

((أَنَّ عُمَرَ حَمَلَ عَلَى فَرَسٍ لَهُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَعْطَاهَا رَسُولَ اللَّهِ

صلى الله عليه وسلم لِيَحْمِلَ عَلَيْهَا رَجُلًا ، فَأُخْبِرَ عُمَرُ أَنَّهُ قَدْ وَقَفَهَا يَبِيعُهَا ، فَسَأَلَ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنْ يَتَّاعَهَا فَقَالَ لَا تَبْتَعُهَا ، وَلَا تَرْجِعَنَّ فِي صَدَقَتِكَ )) [ايضاً]

”حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنا گھوڑا اللہ کی راہ میں دیا آپ نے وہ گھوڑا رسول اللہ کو دیا تاکہ کسی آدمی کو سواری کے لیے دے دیں۔ حضرت عمر کو اطلاع ملی کہ وہ شخص اس کو فروخت کر رہا ہے انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ وہ اسے خرید لیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا اس کو مت خریدیں اور اپنا صدقہ واپس نہ لیں۔“

امام بخاری رضی اللہ عنہ نے اپنے موقف کی تائید میں امام زہری رضی اللہ عنہ کا یہ اثر بھی ذکر کیا ہے:

((قَالَ الزُّهْرِيُّ فِيمَنْ جَعَلَ أَلْفَ دِينَارٍ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ، وَدَفَعَهَا إِلَى غُلَامٍ لَهُ تَاجِرٍ يَتَّجِرُ بِهَا ، وَجَعَلَ رِبْحَهُ صَدَقَةً لِلْمَسَاكِينِ وَالْأَقْرَبِينَ ، هَلْ لِلرَّجُلِ أَنْ يَأْكُلَ مِنْ رِبْحِ ذَلِكَ الْأَلْفِ شَيْئًا ، وَإِنْ لَمْ يَكُنْ جَعَلَ رِبْحَهَا صَدَقَةً فِي الْمَسَاكِينِ قَالَ لَيْسَ لَهُ أَنْ يَأْكُلَ مِنْهَا))

[صحیح بخاری: کتاب الوصیاء باب وقف الدواب والکراع

والعروض والصامت ]

”امام زہری نے اس شخص کے متعلق فرمایا جس نے ہزار دینار اللہ کی راہ میں دیے اور وہ اپنے تاجر غلام کو حوالے کر دیے کہ وہ ان سے تجارت کرے اور اس کا نفع مساکین اور رشتہ داروں کے لیے صدقہ کر دیا کیا وہ شخص اس ہزار کے نفع سے خود کھا سکتا ہے؟ خصوصاً اگر اس کا نفع مساکین کے لیے صدقہ نہ کیا ہو: امام زہری نے فرمایا اس کو (کسی صورت) یہ حق نہیں پہنچتا کہ اس سے کھائے۔“

صحیح موقف:

امام بخاری رضی اللہ عنہ کا تَفَقُّهُ فِي الدِّينِ اور مقام و مرتبہ شک و شبہ سے بالاتر ہے لیکن اگر فریقین کے پیش کردہ دلائل کا باہم تقابل کیا جائے تو حسب ذیل وجوہ کے

باعث ان حضرات کا موقف صائب معلوم ہوتا ہے جو روپے پیسے کے وقف کو جائز نہیں سمجھتے۔

✽ تمام فقہاء اس پر متفق ہیں کہ وقف میں اصل چیز کو باقی رکھ کر صرف اس کی منفعت خرچ کی جائے گی۔ اس کی بنیاد نبی ﷺ کا یہ فرمان ہے:

((إِنْ شِئْتَ حَبَسْتَ أَصْلَهَا، وَتَصَدَّقْتَ بِهَا))

[صحیح بخاری: کتاب الوصایا، باب الوقف کیف یکتب]

”اگر تو چاہے تو اس کا اصل روک لے اور اسکی منفعت (پیداوار) کو صدقہ کر دے۔“

یہ حدیث اس امر کی صریح دلیل ہے کہ وقف وہ چیز ہو سکتی ہے جس کو باقی رکھ کر فائدہ اٹھانا ممکن ہو جبکہ روپیہ اپنی اصل حیثیت میں رہتے ہوئے کوئی فائدہ دینے کی صلاحیت نہیں رکھتا، نہ اس کو کھایا جاسکتا ہے، نہ پہنا جاسکتا ہے، نہ اس میں رہائش رکھی جاسکتی ہے اور نہ ہی اس پر سواری کی جاسکتی ہے یہ تو حصول اشیاء کا ایک وسیلہ ہے یعنی جب تک اس کو خرچ نہ کریں اس سے استفادہ ممکن نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ روپے، پیسے کو کرایہ پر دینا درست نہیں کیونکہ کرایہ اسی چیز کا لیا جاسکتا ہے جسے صرف کے بغیر استعمال کیا جاسکتا ہو جبکہ نقد میں یہ خوبی نہیں اس لیے اس کا کرایہ لینا جائز نہیں ہے۔ اسی بنا پر امام نووی اور علامہ ابن قدامہ رحمہ اللہ نے درہم و دینار کے وقف کا جواز ان لوگوں کا مسلک بیان کیا ہے جو ان کا کرایہ لینا جائز سمجھتے ہیں ملاحظہ ہو: ”روضۃ الطالبین ۲/۲۵۴ المغنی ۲۲۹/۸۔“

جب رائج مسلک کے مطابق ان کا کرایہ درست نہیں ہے مروجہ تکافل کے حامی بھی اس سے متفق ہیں اور وجہ بھی وہی بیان کرتے ہیں جو فقہائے کرام نے وقف کے عدم جواز میں کی ہے کہ نقد کو استعمال کیے بغیر فائدہ اٹھانا ممکن نہیں۔ دیکھیے: ”اسلامی بینکاری کی بنیادیں“ ص: (۱۶۹) از مولانا تقی عثمانی۔“

جب موجودہ تکافل کے مؤیدین بھی یہ تسلیم کرتے ہیں کہ روپیہ پیسہ ایسی چیز نہیں جس کو باقی رکھ کر مستفید ہوا جاسکے تو پھر فقہاء کرام کی اس شرط کہ ”وقف وہی چیز ہو سکتی ہے جو باقی رہ کر قابل فائدہ ہو“ کو نظر انداز کر کے نقد کے وقف کے جواز کا فتویٰ سمجھ سے بالاتر ہے۔

ایک شبہ کا ازالہ:

جو حضرات نقد کے وقف کے قائل ہیں ان کے خیال میں روپے پیسے کو بھی باقی رکھ کر فائدہ حاصل کیا جاسکتا ہے وہ یوں کہ اس سے کاروبار کیا جائے جو نفع ہو وہ خرچ کر دیا جائے۔ مگر یہ توجیہ دو وجہ سے درست نہیں ہے۔

\* ایک تو اس لیے کہ یہ صورت روپے پیسے کو اسکی اصل حیثیت میں باقی رکھ کر فائدہ حاصل کرنے کی نہیں اس طرح کا فائدہ تو روپے پیسے کو کرایہ پردے کر بھی لیا جاسکتا ہے لیکن اس کے باوجود یہ شرعاً جائز نہیں کیوں؟ اس لیے کہ اس قسم کا فائدہ نقد کی تخلیق کا اصل مقصد نہیں ہے جیسا کہ علامہ ابن قدامہ حنبلی رحمۃ اللہ علیہ نے المغنی میں لکھا ہے۔

\* دوسرا اس لیے کہ روپے پیسے کو کاروبار میں لگانے سے فائدہ کی بجائے نقصان کا بھی اندیشہ ہے اور ممکن ہے وقف ختم ہی ہو جائے اس لیے یہ کہنا کہ وقف کی ہوئی رقم سے کاروبار کر کے اس کا نفع خرچ کیا جائے گا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کہ ”اصل روک کر رکھو اور اس کی پیداوار خرچ کرو“ کے خلاف ہے۔

۲۔ جو حضرات نقد کے وقف کو ناجائز کہتے ہیں ان کا موقف درست ہونے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ قائلین نے اپنی تائید میں جو دلائل ذکر کیے ہیں وہ ثبوت کے لیے ناکافی ہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے واقعہ سے ایسی منقولی اشیاء کا وقف تو ثابت ہوتا ہے جن کا اپنا ذاتی استعمال ہو مثلاً گھوڑا اس کا اپنا ذاتی استعمال ہے سواری وغیرہ لیکن نقد جس کا اپنا کوئی ذاتی استعمال نہیں کا وقف ثابت نہیں ہوتا۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے نقد کو

گھوڑے پر قیاس کیا ہے جو درست نہیں کیونکہ دونوں میں واضح فرق ہے۔ یہاں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ بعض اہل علم کی رائے میں یہ وقف تھا ہی نہیں بلکہ صدقہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے تو فرمایا کہ اپنا صدقہ مت خریدو مگر بیچنے والے پر پابندی نہیں لگائی۔ اور نہ ہی حضرت عمر نے اس پر کوئی اعتراض کیا اگر یہ وقف ہوتا تو نبی ﷺ اس کو بھی منع فرما دیتے کیونکہ وقف کو فروخت کرنا جائز نہیں۔

۳۔ امام زہری رضی اللہ عنہ کا اثر بھی دلیل نہیں بن سکتا کیونکہ یہ وقف کے بارہ میں نہیں بلکہ عام صدقہ کے متعلق ہے اس کا قرینہ یہ ہے کہ ان سے پوچھا گیا کیا وہ شخص اس کے نفع سے خود بھی کھا سکتا ہے انہوں نے جواب دیا نہیں۔ اگر یہ وقف ہوتا تو یہ پابندی نہ لگاتے کیونکہ وقف کنندہ کو شرعاً اپنے وقف سے فائدہ اٹھانے کی اجازت ہے۔

محدث اسماعیلی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں زہری رضی اللہ عنہ کا اثر اس وقف کے خلاف ہے جس کی اجازت نبی ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو دی تھی کہ ”اصل کو رو کے رکھو اور ثمرہ خرچ کرو“ سونے چاندی سے تو تب ہی فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے جب اس کو بعینہ کسی دوسری چیز کی طرف نکالا جائے یہ اصل کو رو کے رکھو اور ثمرہ خرچ کرو کی صورت نہیں بنتی۔

[فتح الباری ج ۵ ص: ۴۹۵]

حافظ ابن حجر رضی اللہ عنہ نے محدث اسماعیلی کے اعتراض کا جو جواب دیا ہے وہ صرف زیور جس کا ذاتی استعمال واضح ہے پر منطبق ہوتا ہے درہم و دینار پر نہیں اس لیے اس کو روپے پیسے کے وقف کی دلیل نہیں بنایا جاسکتا۔

موجودہ تکافل کے حامی فتح القدر کے حوالے سے امام زفر رضی اللہ عنہ کے شاگرد محمد بن عبداللہ انصاری رضی اللہ عنہ کے فتویٰ کا ذکر بھی بڑی شد و مد سے کرتے ہیں کہ انہوں نے درہم و دینار کے وقف کو جائز قرار دیا ہے لیکن اگر غور کیا جائے تو یہ فتویٰ خود تکافل کمپنیوں کیخلاف جاتا ہے کیونکہ اس میں یہ الفاظ بھی ہیں:



((قِيلَ وَكَيْفَ؟ قَالَ يَدْفَعُ الدَّرَاهِمَ مُضَارِبَةً ثُمَّ يَتَصَدَّقُ بِهَا فِي

الْوَجْهِ الَّذِي وَقَفَ عَلَيْهِ)) [فتح القدير]

”یہ کیسے ممکن ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ وہ دراہم مضاربہ کی بنیاد پر کاروبار کے

لیے دے پھر ان پر صدقہ کرے جن پر وقف کیا گیا ہے۔“

جبکہ تکافل کمپنیوں کے مالکان اپنے قائم کیے ہوئے وقف سے کسی کو بطور مضاربہ رقم

نہیں دیتے بلکہ خود ہی کاروبار کرتے ہیں اور اس کی باقاعدہ فیس وصول کرتے ہیں۔ امام

زہری رحمہ اللہ کے اثر میں بھی یہی ہے کہ اس نے غلام تاجر کو دیے تھے نہ کہ خود ہی تجارت

میں لگا کر اس کے عوض فیس لینا شروع کر دی۔

اس تفصیل سے واضح ہوتا ہے کہ جو حضرات نقد کے وقف کے قائل ہیں ان کا نقطہ

نظر کمزور ہے۔ لہذا تکافل کمپنیوں کی بنیاد ہی ایسے موقف پر استوار ہے جو دلائل کی قوت

سے محروم ہے۔

فائدہ: یہاں یہ وضاحت کر دینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ تکافل کے

حامیوں کی رائے میں پالیسی ہولڈرز کی اقساط سے جو حصہ وقف پول میں جاتا ہے وہ

وقف کی بجائے وقف کی ملکیت ہوتا ہے جو وقف کے مصالحوں کے علاوہ ان لوگوں پر خرچ

ہوگا جن کے لیے وقف قائم کیا گیا ہوگا جیسا کہ ہم پیچھے بیان کر آئے ہیں سوڈان کے

معروف عالم پروفیسر صدیق محمد امین ضریر کے نزدیک اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے چنانچہ وہ

لکھتے ہیں:

((ومالم يأت الباحث بدليل على أن ما يتبرع للوقف يصرف

للموقوف عليهم فإن تأصيل التأمين التكافلي على أساس

الوقف ينهار من أساسه)) [تعقيب عن بحث تأصيل التأمين

التكافلي على أساس الوقف والحاجة الداعية إليه]

”جب تک محقق (مولانا تقی عثمانی) صاحب اس بات کی دلیل پیش نہیں کرتے کہ

جو عطیہ وقف کو دیا جاتا ہے وہ ان لوگوں پر خرچ کیا جاسکتا ہے جن پر وقف کیا گیا ہو

توقف کی بنیاد پر تکافلی انشورنس کا اصول اپنی بنیاد سے اکھڑ جاتا ہے۔“

فائدہ: یہاں اس امر کا تذکرہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ دنیا میں مروجہ تکافل کی سب سے پہلی کمپنی سوڈان میں ۱۹۷۹ء میں صدیق محمد امین زیر نگرانی قائم ہوئی تھی لیکن اس کی بنیاد وقف کی بجائے تبرع پر تھی۔ مگر اس کو وقف کی بنیاد پر قائم تکافل کمپنیوں کے مفتیان کرام جائز نہیں سمجھتے۔

بعض تحقیق طلب مسائل:

مروجہ اسلامی انشورنس میں ایلوکیشن اور ایڈمن فیس کے نام پر وصولی بھی غور طلب پہلو ہے جیسا کہ ہم گزشتہ صفحات میں بیان کر آئے ہیں کہ پہلے سال قسط کی ستاسی (یہ زیادہ سے زیادہ ہے) دوسرے سال بیس جبکہ تیسرے سال دس فیصد رقم ایلوکیشن فیس کے نام پر کاٹ لی جاتی ہے یہ ساری رقم کنسلٹنٹ جو کسٹمر گھیر کر لاتا ہے اور برانچ ذمہ داران کی جیبوں میں جاتی ہے۔ پالیسی ہولڈر کو اس کا علم نہیں ہوتا۔ یہ بالکل وہی طریقہ ہے جو روایتی انشورنس کا ہے کہ پہلی قسط کا معتد بہ حصہ انشورنس کمپنی کے ایجنٹ کو دے دیا جاتا ہے۔ جب نام نہاد اسلامی انشورنس نظریاتی مرحلہ میں تھی تب یہ کہا جاتا تھا کہ روایتی انشورنس میں یہ ظلم ہوتا ہے کہ پہلی قسط تقریباً پوری کی پوری ایجنٹ کی جیب میں چلی جاتی ہے جبکہ تکافل میں یہ نہیں ہوتا۔ لیکن جب عملی مرحلہ آیا تو نام نہاد اسلامی انشورنس نے بھی وہی راستہ اختیار کیا۔ ہمارے خیال میں یہ پالیسی ہولڈر کے ساتھ زیادتی ہے وہ اس طرح کہ اگر وہ ایک قسط ادا کرنے کے بعد تکافل کمپنی کو الوداع کہتا ہے تو قواعد و ضوابط کے مطابق اس کو صرف وہ رقم ملتی ہے جو انوسٹمنٹ کھاتے میں جمع ہو یا پھر اس سے حاصل ہونے والا نفع۔ اب ستاسی فیصد تو ایلوکیشن فیس کے نام پر پہلے ہی الگ کیا جا چکا ہے باقی تیرہ فیصد بچا اس میں سے آدھا وقف میں چلا گیا جو شرعاً واپس نہیں لیا جاسکتا۔ جو باقی رہ گیا اس میں سے ڈیڑھ فیصد مینجمنٹ اور ۶۵ سے لیکر ایک سو دس روپے تک ماہانہ ایڈمن

فیس بھی لی جانی ہے۔ پالیسی ہولڈر کے ہاتھ کیا آیا؟ تکافل کمپنی کے تنخواہ دار شریعہ بورڈ کے مفتیان کرام کا ایک عدد فتویٰ اور اس کے نتیجے میں اسلام کے نظام تکافل کے متعلق پیدا ہونے والی بدگمانی کہ یہ بھی استحصال پر مبنی نظام ہے۔ (اعاذنا اللہ منہ) ایلوکیشن فیس کی اس کے علاوہ کوئی توجیہ نہیں کی جاسکتی کہ یہ باطل حربوں سے مال کھانے کی بدترین شکل ہے۔

ایک غیر معقول استدلال:

مروجہ تکافل کے حامی بڑی سادگی سے کہتے ہیں کہ ہم ہر بات پہلے بتا دیتے ہیں۔ ناجائز تو تب ہو جب کوئی بات خفیہ رکھی جائے۔ یہ انتہائی لغو قسم کا استدلال ہے۔ کیا بتا کر باطل طریقے سے کسی کا مال ہڑپ کرنا جائز ہو جاتا ہے؟ ناجائز کاروبار میں ملوث لوگوں کی اکثریت بھی یہی کہتی ہے کہ ہم ہر بات پہلے طے کرتے ہیں، پھر یہ ناجائز کیسے؟ کیا تکافل کے حامی اس حقیقت سے بے خبر ہیں کہ اسلام نے بعض معاملات محض اس لیے ناجائز قرار دیے ہیں کہ ان سے کسی ایک فریق کو نقصان پہنچ رہا ہوتا ہے۔

### خلاصہ

مذکورہ بالا تفصیل کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

- ✽ مروجہ تکافل شرعی تکافل سے بالکل مختلف ہے۔
- ✽ روایتی انشورنس کی طرح رائج الوقت تکافل بھی سود اور غرر پر مشتمل ہے۔
- ✽ تکافل پالیسی عقد معاوضہ ہے نہ کہ عقد تبرع جیسا کہ تکافل کے حامی باور کراتے ہیں۔
- ✽ رائج نقطہ نظر کے مطابق نقدی کو وقف نہیں کیا جاسکتا۔ لہذا تکافل کمپنیوں کی بنیاد ہی غلط ہے۔

✽ ایلوکیشن فیس باطل طریقہ سے مال ہڑپ کرنے میں داخل ہے۔



## قرض کے مسائل

قرض لینا پسندیدہ نہیں:

قرض چونکہ ”رات کی پریشانی اور دن کی ذلت ہے“ اس لیے شریعت اسلامیہ عام حالات میں قرض لینے کو پسند نہیں کرتی۔ نبی ﷺ خود بھی قرض سے پناہ مانگتے اور اپنے ساتھیوں کو بھی اس سے بچنے کی تلقین فرماتے۔ ذیل میں اس سلسلے کی بعض روایات ملاحظہ فرمائیں:

((أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ كَانَ يَدْعُو فِي الصَّلَاةِ وَيَقُولُ اللَّهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنَ الْمَأْتَمِ وَالْمَغْرَمِ فَقَالَ لَهُ قَائِلٌ مَا أَكْثَرَ مَا تَسْتَعِيدُ يَا رَسُولَ اللَّهِ مِنَ الْمَغْرَمِ قَالَ إِنَّ الرَّجُلَ إِذَا غَرِمَ حَدَّثَ فَكَذَبَ وَوَعَدَ فَأَخْلَفَ)) [صحيح البخارى ، باب من استعاذ من الدين]

”بلاشبہ رسول اللہ ﷺ نماز میں یہ دعا کیا کرتے تھے اے اللہ میں گناہ اور قرض سے آپ کی پناہ طلب کرتا ہوں۔ ایک کہنے والے نے آپ سے عرض کیا اے اللہ کے رسول آپ قرض سے کس قدر زیادہ پناہ مانگتے ہیں۔ آپ نے فرمایا بلاشبہ انسان جب مقروض ہوتا ہے بات کرتا ہے تو جھوٹ بولتا ہے اور وعدہ کرتا ہے تو خلاف ورزی کرتا ہے۔“

((لَا تُخِيفُوا أَنْفُسَكُمْ أَوْ قَالَ الْأَنْفُسَ فَقِيلَ لَهُ يَا رَسُولَ اللَّهِ وَمَا نُخِيفُ أَنْفُسَنَا قَالَ الدِّينَ)) [مسند احمد ، حديث عقبه بن عامر الجهني]

”اپنی جانوں کو خوف میں مبتلا نہ کرو آپ سے کہا گیا اے اللہ کے رسول ہم کیسے اپنی جانوں کو خوف میں مبتلا کرتے ہیں فرمایا قرض کے ساتھ۔“

پہلی حدیث سے یہ پتہ چلتا ہے کہ قرض مقروض کو جھوٹ اور وعدہ کی خلاف ورزی تک پہنچا دیتا ہے جبکہ دوسری حدیث یہ بتا رہی ہے کہ قرض لینے والے انسان کا امن و سکون ختم ہو جاتا ہے۔

معقول عذر کی بنا پر قرض لینے کی اجازت ہے:

تاہم ناگزیر حالات میں قرض لینے کی گنجائش رکھی گئی ہے بشرطیکہ مستقبل میں ادائیگی کا امکان اور پختہ ارادہ ہو۔ ذخیرہ حدیث میں اس کی کافی مثالیں موجود ہیں۔ یہاں صرف ایک واقعہ نقل کیا جاتا ہے۔ عبد اللہ بن ابی ربیعہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

(( اسْتَقْرَضَ مِنِّي النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَرْبَعِينَ أَلْفًا فَجَاءَهُ مَالٌ فَدَفَعَهُ إِلَيَّ وَقَالَ بَارَكَ اللَّهُ لَكَ فِي أَهْلِكَ وَمَالِكَ إِنَّمَا جَزَاءُ السَّلْفِ الْحَمْدُ وَالْأَدَاءُ ))

[سنن النسائي، باب الاستقراض]

”نبی ﷺ نے مجھ سے چالیس ہزار قرض لیے آپ کے پاس مال آیا تو آپ نے مجھے لوٹا دیے اور فرمایا اللہ تیرے اہل اور مال میں برکت پیدا فرمائے قرض کا بدلہ تو شکر یہ ادا کرنا اور (قرض کی) ادائیگی ہے۔“

ذاتی ضرورت کے علاوہ اجتماعی اور ملکی ضرورت کے لیے بھی قرضہ لیا جاسکتا ہے۔

قرض معاف نہیں ہوگا:

شریعت کی نگاہ میں قرض کی عدم ادائیگی ناقابل معافی گناہ ہے۔ چنانچہ آپ ﷺ

کا فرمان ہے:

(( يُغْفَرُ لِلشَّهِيدِ كُلِّ ذَنْبٍ إِلَّا الدَّيْنَ )) [صحيح مسلم، باب من قتل

في سبيل الله]

”شہید کا قرض کے علاوہ ہر گناہ معاف کر دیا جاتا ہے۔“

رسول اللہ ﷺ نے صاحب استطاعت مقروض کی طرف سے قرض کی ادائیگی میں ٹال مٹول کو بھی ظلم قرار دیا ہے۔

((مَطْلُ الْغَنِيِّ ظُلْمٌ)) [صحيح البخارى: باب إِذَا أَحَالَ عَلَى مَلِيٍّ فَلَيْسَ لَهُ رَدٌّ]

”صاحب استطاعت مقروض کا ٹال مٹول کرنا ظلم ہے۔“

ہاں اگر مقروض تنگ دست ہو تو قرآنی حکم کے مطابق اس کو فراخ دستی تک مہلت ملنی چاہیے۔

﴿وَإِنْ كَانَ ذُو عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ إِلَىٰ مَيْسَرَةٍ﴾ [البقرة: ۲۸۰]

”اگر مقروض تنگ دست ہے تو اس کو آسودہ حالی تک مہلت ملنی چاہیے۔“

قرض کے بدلے فائدہ اٹھانا:

قرض کی وجہ سے حاصل ہونے والا ہر فائدہ سود ہے۔ ہم پیچھے حضرت ابی بن کعب، حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم کے حوالے سے بیان کر آئے ہیں کہ:

((انهم نهوا عن قرض جرّ منفعة)) [ارواء الغلیل: ۲۳۴/۵]

”انہوں نے اس قرض سے منع کیا جو فائدے کا باعث بن رہا ہو۔“

بلکہ حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ تو مقروض کی طرف سے دیے گئے ہدیہ کو بھی سود قرار دیتے تھے۔ چنانچہ ان کا یہ فتویٰ صحیح بخاری میں بایں الفاظ نقل ہوا ہے:

((إذا كان لك على رجل حق فاهدى اليك حمل تبن او

حمل شعير او حمل قت فلا تاخذه فانه ربا))

[صحيح بخارى، كتاب المناقب، باب مناقب عبدالله بن سلام]

”جب تمہارا کسی شخص پر کوئی حق ہو اور پھر وہ تمہیں ایک تنکے، جو کے ایک دانے یا

ایک گھاس کے برابر بھی ہدیہ دے تو اسے قبول نہ کرنا، کیونکہ وہ بھی سود ہے۔“

البتہ اگر قرض خواہ اور مقروض کے درمیان پہلے سے ہدیہ کا تبادلہ چلا آ رہا ہو تو پھر اس کی اجازت ہے۔

نبی ﷺ نے تو قرض دینے کے ساتھ کوئی چیز خریدنے یا بیچنے کی شرط لگانے کی بھی اجازت نہیں دی۔

(( لَا يَحِلُّ سَلْفٌ وَبَيْعٌ )) [سنن الترمذی، باب ما جاء فی کراہیۃ

بیع مالیس عندہ]

”قرض اور بیع جائز نہیں۔“

یعنی قرض خواہ کا یہ شرط لگانا کہ میں تب قرض دوں گا جب آپ یہ چیز مجھ سے خریدیں گے یا اپنی فلاں چیز مجھے بیچیں گے، درست نہیں۔

ہاں! اگر مقروض ادائیگی کے وقت بغیر شرط کے از خود زائد واپس کرے تو اس میں کوئی حرج نہیں کیونکہ یہ ”حسن القضاء“ یعنی عمدہ طریقے سے ادائیگی کرنے میں شامل ہے اور یہ آپ کی سنت ہے۔ مگر اس کو بطور نظام کے اختیار نہیں کیا جاسکتا کیونکہ یہ طے شدہ اضافہ ہی شمار ہوگا۔

قرض میں گروی کا مطالبہ جائز مگر اس سے فائدہ اٹھانا ناجائز ہے: شریعت نے قرض دہندہ کو یہ حق دیا ہے کہ وہ قرض کی واپسی یقینی بنانے کے لیے حصول قرض کے خواہشمند سے یہ مطالبہ کر سکتا ہے کہ وہ اپنی کوئی چیز بطور ضمانت اس کے حوالے کرے اس کو رہن کہتے ہیں۔ قرآن حکیم میں ارشاد ہے۔

﴿وَإِنْ كُنْتُمْ عَلَىٰ سَفَرٍ وَلَمْ تَجِدُوا كَاتِبًا فَرِهَانٌ مَّقْبُوضَةٌ﴾

[البقرة: ۲۸۳]

”اور اگر تم سفر پر ہو اور کوئی لکھنے والا نہ پاؤ تو گروی قبضہ میں دے دیا کرو۔“

سفر کا ذکر اس لیے کیا کہ سفر کی حالت میں گروی کا معاملہ پیش آنے کا احتمال زیادہ

ہوتا ہے یہ مطلب نہیں کہ سفر کے علاوہ گروی جائز نہیں۔

قرآن مجید کے علاوہ نبی ﷺ کی سنت سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے۔

((أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اشْتَرَى مِنْ يَهُودِيٍّ طَعَامًا إِلَى

أَجَلٍ وَرَهْنَهُ دِرْعَهُ)) [صحيح البخاري: باب من رهن درعه]

”نبی ﷺ نے ایک یہودی سے ادھار غلہ خریدا اور اس کے پاس اپنی زرہ گروی رکھی۔“

چونکہ رہن یا گروی کا مقصد صرف قرض دہندہ کو اس بات کا اطمینان دلانا ہے کہ آپ کا قرض بہر صورت واپس کیا جائے گا اس لئے قرض دہندہ کو گروی سے فائدہ اٹھانے کا حق نہیں پہنچتا کیونکہ قرض کے بدلے حاصل شدہ ہر فائدہ سود شمار ہوتا ہے جیسا کہ قبل ازیں بیان ہو چکا ہے۔

مکان گروی لین دین کی شرعی حیثیت:

اس کی مروجہ صورت یہ ہے کہ ایک شخص حصول قرض کے لیے اپنی جائیداد بطور گروی قرض دہندہ کے قبضہ و تصرف میں دے دیتا ہے۔ اس طرح جائیداد مذکور قرض کی واپسی کی ضمانت ہونے کے ساتھ ساتھ قرض دہندہ کے لیے مالی مفاد کا باعث بھی ہوتی ہے کہ وہ حسب ضرورت معینہ مدت تک کرایہ ادا کیے بغیر رہائش رکھ سکتا ہے یا کسی دوسرے کو دیکر کرایہ خود وصول کر سکتا ہے۔

یہ معاملہ جائز نہیں ہے کیونکہ شرعاً گروی سے فائدہ اٹھانا سود کے زمرہ میں آتا ہے۔

قرض اور دین (Debt) میں فرق:

قرض کا مطلب ہے Loan یعنی کسی کو مال دینا تاکہ وہ فائدہ اٹھانے کے بعد اسی مقدار میں واپس کرے۔ جبکہ دین ہر اس حق کو کہتے ہیں جس کی ادائیگی انسان پر لازم ہو۔ اس میں قرض کے علاوہ وہ ادائیگیاں بھی شامل ہیں جو کوئی چیز خریدنے یا کرایہ پر



حاصل کرنے یا کوئی چیز ضائع کرنے کی وجہ سے انسان پر واجب ہوتی ہیں۔ گویا قرض کے مقابلے میں دین کے مفہوم میں وسعت پائی جاتی ہے۔

قرض اور دین کی ادائیگی کا معیار:

کاغذی کرنسی کی اپنی ذاتی قدر و قیمت کچھ بھی نہیں ہے یہ صرف اشیاء و خدمات کی قوت خرید کی نمائندگی کرتی ہے اس بنا پر نوٹ کی ویلیو کا تعین اشیاء و خدمات کی قیمتوں سے ہوتا ہے، قیمتیں کم ہو جائیں تو اس کا مطلب ہوتا ہے نوٹ کی ویلیو بڑھ گئی ہے اور قیمتیں بڑھ جائیں تو سمجھا جاتا ہے نوٹ کی قوت خرید کم ہو گئی ہے۔ چنانچہ اشیاء و خدمات کے مقابلے میں کرنسی کے اضافے کو افراط زر کہا جاتا ہے۔

چونکہ افراط زر کی وجہ سے نوٹ کی قوت خرید کم ہوتی رہتی ہے ہزار روپے کے نوٹ سے جو چیز آج خریدی جاسکتی ہے وہ چھ ماہ بعد نہیں خریدی جاسکتی، لہذا قرض کی بحث میں یہ سوال بھی ابھر کر سامنے آتا ہے کہ نوٹ کی قوت خرید میں جو کمی آتی ہے کیا قرض واپس کرتے وقت وہ کمی بھی ادا کی جائے گی یا یہ سود شمار ہوگی۔ یہ نہایت اہم اور بحث طلب سوال ہے۔ اس سلسلے میں بعض حضرات یہ تجویز پیش کرتے ہیں کہ

✽ قرض کی ادائیگی سونے سے وابستہ ہونی چاہیے یعنی قرض دیتے وقت یہ سمجھنا چاہیے کہ نوٹوں کی بجائے سونا قرض دیا جا رہا ہے اور قرض دی گئی رقم کے بدلے جتنا سونا اس دن خریدا جاسکتا تھا جس دن قرض دیا گیا تھا واپسی کے وقت اتنا سونا یا اس کی قیمت ادا کی جانی چاہیے۔ لیکن یہ رائے صائب نہیں کیونکہ اس کی بنیاد اس نظریے پر ہے کہ نوٹ کی پشت پر سونا ہے حالانکہ یہ بات طے شدہ ہے اب نوٹ سونے کی نمائندگی نہیں کرتے۔

✽ بعض اہل علم کی رائے میں قرض کی واپسی قیمتوں کے اشاریہ سے مربوط ہونی چاہیے اس کا مطلب ہے کہ قرض کی واپسی کے وقت نوٹوں کی اتنی مقدار زیادہ ادا کی جانی

چاہیے جو افراط زر کی شرح کے مساوی ہو۔ مثلاً ایک ہزار روپے قرض دیے گئے ادا یگی کی تاریخ تک قیمتوں میں بیس فیصد اضافہ ہو گیا تو اب ایک ہزار کی بجائے بارہ سو روپے واپس کیے جائے۔ لیکن یہ نقطہ نظر بھی کمزور ہے۔

✽ ایک تو اس لیے کہ قیمتوں کا اشاریہ تخمینہ ہے کیونکہ اس کے لیے صارف کی ٹوکری

(Consumer s Basket) کا طریقہ اختیار کیا جاتا ہے اور صارف کی اس ٹوکری

میں کئی ایسی اشیاء بھی شامل ہوتی ہیں جن کا عام صارف سے دور کا بھی واسطہ نہیں

ہوتا، ظاہر ہے یہ طریقہ کار تخمینہ ہے جبکہ قرض کی ادا یگی میں حقیقی برابری ضروری ہے۔

✽ دوسرا اس لیے کہ شرعی طور پر قرض کی ادا یگی میں قوت خرید کی بجائے مقدار میں

برابری کا اعتبار کیا جاتا ہے۔ فقہ اسلامی کا معروف اصول ہے "الذیون تُقضى

بأمثالہا ادھار اور قرض کی ادا یگی مثل سے ہی ہوتی ہے" یعنی اگر ایک شخص کے ذمہ

کوئی ناپ کر دی جانے والی چیز ہے تو بوقت ادا یگی ناپ کر ہی دے اور اگر گنتی کر

کے دی جانے والی چیز ہے تو گن کر ہی دے خواہ بوقت ادا یگی مالیت میں فرق آچکا ہو۔

✽ اور تیسرا اس لیے کہ اس میں غرر کا عنصر شامل ہے کیونکہ ایک عوض کو مستقبل کے

حوالے سے مجہول چھوڑ دیا جاتا ہے اور ایسے تمام عقود باطل ہیں جن میں غرر کا

عنصر موجود ہو۔

✽ اس حوالے سے تیسری تجویز یہ پیش کی جاتی ہے کہ قرض کا لین دین روپے کی بجائے

ڈالر میں کیا جائے یعنی اگر کسی شخص کو ایک ہزار روپے کی ضرورت ہو تو قرض دینے

والا ہزار روپے کی جگہ اتنی مالیت کے ڈالر خرید کر دے اور مقروض بھی ڈالر ہی واپس

کرے۔ مگر بوجہ یہ تجویز بھی قابل عمل نہیں۔

✽ افراط زر کا اثر ڈالر پر بھی پڑتا ہے روپے کی نسبت کم سہی مگر پڑتا ضرور ہے۔

✽ شہری علاقوں سے دور دیہات اور قصبہات میں بے شمار ایسے لوگ ہیں جن کے لیے

منی چیخرتک پہنچنا ہی ایک مسئلہ ہے اس تجویز کے مطابق قرض کا لین دین مشکلات کو دعوت دینے کے مترادف ہوگا۔

✽ اس تجویز کے مطابق قرض خواہ اور مقروض کو دو مرتبہ منی چیخرتک کے پاس جانا پڑے گا ایک مرتبہ ڈالر لینے اور دوسری مرتبہ ڈالر کے بدلے روپے حاصل کرنے کے لیے۔ ظاہر ہے ہر مرتبہ کمیشن بھی دینا پڑے گا جس سے قرض کا لین دین مزید بوجھ بن جائے گا۔

اس لیے صحیح موقف یہی ہے کہ قرض میں سو کے بدلے سو کا نوٹ ہی واپس کرنا ضروری ہے خواہ اس کی قوت خرید کم ہو چکی ہو۔

ایک اعتراض کا جواب:

بعض حضرات کہتے ہیں یہ تو قرض خواہ پر ظلم ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ قرض دینا مقروض کے ساتھ ہمدردی ہے اسی لیے ہماری شریعت نے دو مرتبہ قرض دینے کو ایک مرتبہ صدقہ کرنے کے برابر قرار دیا ہے۔ چنانچہ آپ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

(( مَا مِنْ مُسْلِمٍ يُقْرِضُ مُسْلِمًا قَرْضًا مَرَّتَيْنِ إِلَّا كَانَ كَصَدَقَتِهَا مَرَّةً ))

[سنن ابن ماجہ ، باب القرض]

”جو مسلمان کسی مسلمان کو دو مرتبہ قرض دے وہ ایک دفعہ صدقہ کے برابر ہوگا۔“

یعنی ایک مرتبہ قرض دینا نصف صدقہ کے مساوی ہے۔

اگر کوئی اس اجر و ثواب پر مطمئن نہیں ہے تو اس کے لیے بہتر ہے کہ وہ قرض نہ دے

اسلام اس کو مجبور نہیں کرتا۔

اگر حصول نفع کا ارادہ ہو تو اس کے لیے قرض کی بجائے شرکت و مضاربت کو اختیار

کیا جانا چاہیے۔

اس سلسلے میں یہ امر بھی لائق توجہ ہے کہ معاشی ماہرین کے نزدیک افراط زر بہت سے عوامل کے مجموعی عمل کا نتیجہ ہوتا ہے اس کی ذمہ داری کسی ایک شخص پر عائد نہیں ہوتی۔ لہذا کرنسی کی قوت خرید میں کمی کا ذمہ دار مقروض کو ٹھہرانا قرین انصاف نہیں ہے۔

### خلاصہ

- ✽ سوائے انتہائی مجبوری کے قرض لینے سے اجتناب کرنا چاہیے۔
- ✽ قرض ہر حال میں واپس کرنا چاہیے۔
- ✽ قرض کے عوض فائدہ اٹھانا جائز نہیں۔
- ✽ گروی سے فائدہ اٹھانا درست نہیں ہے۔
- ✽ مکان گروی لین دین کی مروجہ صورت غیر شرعی ہے۔
- ✽ قرض کی واپسی نوٹ پر لکھی ہوئی قیمت کے مطابق ہوگی قوت خرید کا اعتبار نہیں کیا جائے گا یعنی سو (۱۰۰) کے بدلے سوکانوٹ ہی واپس کیا جائے گا۔





## ابو ہریرہ شریعہ کالج

احباب دانش جانتے ہیں کہ اب تک ملک بھر میں ابو ہریرہ شریعہ کالج واحد ادارہ ہے جس میں لازمی (Compulsary) نصاب کے طور پر بیک وقت درس نظامی اور گریجویٹیشن کروائی جاتی ہے۔ لہذا اپنے بچوں کو ابو ہریرہ کالج میں داخل کروائیں تاکہ وہ دینی و دنیوی علوم سے آراستہ ہو سکیں۔ بفضل اللہ تعالیٰ یہ ادارہ صرف مقامی احباب کی مدد سے چل رہا ہے۔

## داخلہ میٹرک کے رزلٹ سے پہلے اور امتحان کے فوراً بعد

میٹرک کا امتحان دینے والے طلباء داخلہ لے سکتے ہیں۔ تاہم فیل ہونے کی صورت میں طالب علم کو فارغ کر دیا جائے گا۔

## نصاب

سال اول: ترجمہ القرآن سورۃ الفاتحہ تا الاعراف، مشکوٰۃ اول، علم النحو، کتاب النحو، علم الصرف، ابواب الصرف، دروس اللغة العربیة (دو حصے)، فرسٹ ایئر بمطابق انٹرمیڈیٹ بورڈ لاہور۔

سال دوم: ترجمہ القرآن سورۃ الاعراف تا النمل، مشکوٰۃ ثانی، نحو میر، شرح مائتہ عامل، کتاب الصرف، اطیب المنخ، معلم الانشاء (دو حصے) سیکنڈ ایئر بمطابق انٹرمیڈیٹ بورڈ لاہور۔

سال سوم: ترجمہ القرآن، مسلم شریف، ترمذی شریف، ہدایۃ النحو، علم الصیغہ، السراجی، شرح نخبۃ الفکر، تھرڈ ایئر۔

سال چہارم: بخاری شریف، ہدایۃ، الوجیز، شرح ابن عقیل، الفوز الکبیر، نور تھ ائیئر نصاب، بمطابق پنجاب یونیورسٹی۔

## ابو ہریرہ اکیڈمی کی نشریات، از قلم: میاں محمد جمیل

فہم القرآن: ابن کثیر، رازی، دیگر عربی تفاسیر کا خلاصہ اور تفسیر ثنائی، معارف، تدبر، تفہیم القرآن کے اہم نکات پر مشتمل، جدید و قدیم علوم کا سنگم جس میں رواں ترجمہ اور تفسیر بالحدیث کا التزام۔

اقتیاز تفسیر: لفظی ترجمہ، آیت کے مسائل کی الگ الگ نشاندہی، ہر آیت کے مرکزی مضمون کی تفسیر بالقرآن کے ذریعے ایک مکمل تقریر۔ پہلے پندرہ پارے تین جلدوں میں دستیاب ہے۔ تفسیر کا آغاز 2005ء میں کیا گیا اور ہر سال پانچ پاروں پر مشتمل جلد پیش کی جا رہی ہے۔ ان شاء اللہ 2011ء میں مکمل ہو جائے گی۔

فہم الحدیث: مشکوٰۃ المصابیح سے متفق علیہ اور بخاری و مسلم کی مکمل روایات۔ اس کے مطالعہ سے تعلیم یافتہ طبقہ کو 80 فیصد مسائل کسی عالم سے پوچھنے کی ضرورت نہیں رہتی۔

دیگر تصانیف: سیرت ابراہیم علیہ السلام، انبیاء علیہم السلام کا طریقہ دعا، دین تو آسان ہے، زکوٰۃ کے مسائل و فوائد، آپ ﷺ کا تہذیب و تمدن، مشکلات کیوں؟ نکلنے کے الہامی راستے، آپ ﷺ کا حج (مختصر مگر جامع، ہر رکن کا فلسفہ)، فضیلت قربانی اور اس کے مسائل، آپ ﷺ کی نماز (قیام و سجود کی عملی تصویر)، برکات رمضان، اتحاد امت و نظم جماعت، جادو کی تباہ کاریاں..... ان کا شرعی علاج۔

ملنے کا پتہ: نعمانی کتب خانہ، مکتبہ سلفیہ، مکتبہ قدوسیہ، مکتبہ دارالسلام اردو بازار لاہور۔

میاں محمد جمیل، پرنسپل ابو ہریرہ شریعہ کالج، 37- کریم بلاک علامہ اقبال ٹاؤن لاہور۔ 042-35417233